زبانیں جہاں چُپ ہیں

پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیماب کا پشتو ناول " طالبہ خدائے کہ بہ مُلا شے " جہاں پشتو اہل قلم میں اپنے موضوع کے اعتبار سے مقبولیت حاصل کر چکا اور اسے ایوارڈ بھی ملے، وہاں اُردو زبان میں بھی اس ناول کو ترجمہ کرنے اور پیش کرنے کی اہمیت، اپنے سنجیدہ موضوع کے حوالے سے محسوس کی گئی۔ ایسا موضوع جس نے اس خطے کے عوام کو بالخصوص اپنے لپیٹ میں گزشتہ چالیس برس سے لے رکھا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ عالمی سطح پر، اس خطے میں، اپنے مخصوص کردار کے حوالے سے طالب یا طالبان کی شہرت پھیلی ہوئی ہے، جس پر بڑے بڑے مہان ادیبوں اور دانشوروں نے قلم فرسائی کی ہے، اور اس حوالے سے پیدا ہونے والے مسائل کی جڑوں تک پہنچنے کی سعی کرتے رہے ہیں۔

طالب یا طالبان، پشتون معاشرے میں صدیوں سے ایک زندہ کردار کے طور پر نمایاں رہے ہیں۔ لغوی طور پر طالب (طلب کرنے والے) درحقیقت علم کی طلب کرنے والے کو پشتون معاشرے میں طالب کہا جاتا ہے۔ وہ بھی دینی اور مذہبی علم حاصل کرنے والے کو۔ ویسے تو اصطلاح اُردو زبان میں بھی طالب علم کی صورت میں مروج ہے۔ لیکن پشتو میں اس کا تعلق بطور خاص مذہبی درسگاہوں سے ہے۔ جہاں پشتون اپنی اولادوں کو دینی اور مذہبی علوم سیکھنے کیلئے بھیجتے ہیں۔

مذہبی درسگاہوں میں علم کا حصول زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اسے بجا طور پر یہودیت اور عیسائیت کا ثمرہ کہا جاسکتا ہے۔ اصطلاحات بے شک مختلف ہیں لیکن اسلام میں اس کا آغاز "مدرسہ جنیدیہ" سے ہوتا ہے۔ جو تصوف کے میدان میں "امام تصوف" کہلائے جاتے ہیں۔ اسلام میں جب خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو اس کے رد عمل میں ایسے مدارس کا آغاز ہوا جسکا سلسلہ ابھی تک چلا آرہا ہے۔ ہم اس کے تاریخی پس منظر میں نہیں پڑنا چاہتے کہ اس طرح بات [illegible] ہو جائے گی۔

Ketabton.com

(c) ketabton.com: The Digital Library

زیر نظر ناول کو پشتو زبان میں بھی ہم نے پڑھا تھا، اور اب اُردو زبان میں، جس کا ترجمہ کرنے کا شرف " نجیب اللہ زڑگئے علی خیل" کو حاصل ہوا، بھی ہماری نظروں کو دعوتِ مطالعہ کرنے کیلئے پیش ہوا۔ تو ممنونیت کے اظہار کے طور پر چند سطریں تحریر کر رہا ہوں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا کہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کا ترجمہ یقینی طور پر وقت کی اہم ضرورت ہے۔ فاضل ناول نگار پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیماب نے " بدنامِ زمانہ طالب" (معذرت کے ساتھ) کے کردار کو اس زمانے سے منسلک کیا ہے جب پڑوسی ملک افغانستان میں طالبان کا دور حکومت تھا۔ عالمی سیاست میں طالب کے کردار کو کس طرح استعمال کیا گیا، اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں ناول کے طالب عبدالولی کی نفسیات کو بھی سمجھنا ہو گا۔ جو بظاہر تو فرد واحد ہے لیکن اپنے کردار کے پس منظر میں وہ اُن تمام طالبان کے کردار کو نمایاں کر رہا ہے، جو پشتون معاشرے میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور جو اب اپنے اصل کردار کے علاوہ، دوسروں کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں، لیکن کیوں؟ اس کیوں کا جواب حاصل کرنے کیلئے فاضل ناول نگار نے پشتو میں کہ وہ خود بھی پشتون ہیں اور پشتون مزاج اور نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، بڑی خوبی کے ساتھ اپنے فکر و فہم کو استعمال کر چکے ہیں۔ ہم نے بحیثیت ایک پشتون کے جو ذائقہ اس ناول کے پشتو ورژن میں محسوس کیا، وہی ذائقہ اُردو ورژن میں محسوس کیا۔ اس میں مترجم بھی داد کے مستحق ہیں۔ تاہم زبان و بیان کے سلسلے میں جو تھوڑی بہت کمزوریاں نظر میں آئی تھیں، وہ دُور کر دی گئی ہیں۔ اور اب یہ اُردو دان طبقے پر منحصر ہے کہ وہ اس ناول کو پڑھتے ہوئے پشتون معاشرے میں طالب کے کردار کو اپنے فہم اور دانست میں کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو طالب بھی ایک انسان ہے، ہماری اور آپ کی طرح کا۔ وہ طالب کیوں بنتا ہے، طالب بن کر کیا کام کرتا ہے۔ ایک طالب اپنے آپ کو، اپنے خاندان کو، اپنے آس پاس کے ماحول کو، اور سب سے زیادہ اپنے جذبات اور خواہشات کو کن پیمانوں سے تولتا اور پرکھتا

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہے۔اس کو جاننے کے بعد اب طالب کو اتنا موردِ الزام نہیں ٹھہرائیں گے۔ جتنا کہ عوامل کو کوسیں گے۔جو طالب کو اپنے اصل ہدف سے ہٹا کر کسی اور سمت میں دھکیل چکے ہیں۔

فی زمانہ اگر طالب قابل نفرت ٹھہرایا گیا ہے، تو طالب کو موجودہ روپ دینے میں وہ عوامل زیادہ قابل نفرت ہیں جنہوں نے اپنی علمیت اور ذہانت کی بجائے اپنی جہالت اور کج فہمی کا ثبوت، طالب سے بڑھ چڑھ کر دیا ہے۔

زیر بحث ناول ۲۳ ابواب پر تقسیم ہے۔ جس میں عبدالولی کے مدرسہ کے طالب بننے سے لے کر جنگجو طالب بننے تک کی داستان رقم ہے۔ یہ ایک طالب کی نفسیات کی کہانی ہے جو ہماری اور آپ کی طرح کا انسان ہے، جو جذبات اور خواہشات رکھتا ہے۔ جس کی حقیقی انسانی جذبات اور خواہشات کو معاشرہ میں غریب اور امیر کی تفریق نے بری طرح سے کچل کر رکھ دیا ہے۔یہی تفریق اس کی شخصیت کے خدوخال کو اُبھارتی ہے۔ اور ایک ایسی کہانی جنم لیتی ہے جو نہ صرف ایک انسان کی کہانی ہے بلکہ ہمارے موجودہ دور کی بخیہ گری کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کراتی ہے۔

ناول کے پہلے پانچ ابواب طالب عبدالولی کی شخصیت سازی سے متعلق ہیں جو پشتون معاشرہ میں معاشی ومالی تفاوت کے پیش نظر خانگی زندگی، سماجی اور معاشرتی طور پر بنت کا کام دے رہے ہیں۔ایک طالب جو مذہبی علوم کے حصول کیلئے وقف کر دیا جاتا ہے تو گویا اُسے دنیاوی مشاغل سے کٹ آف ہونا پڑتا ہے۔ کم عمری میں ایک طالب یہ جبر اس کی نفسیات پر ایک کاری ضرب ہی تو ہے۔

چھٹے باب میں منظرنامہ تبدیل ہوتا ہے۔ کہ اُن دنوں افغانستان میں تحریک طالبان نے سر اُٹھایا تھا۔ افغانستان کے عوام مجاہدین کے داخلی جھگڑوں سے تنگ آچکے تھے۔ مجاہدین کمانڈروں نے اپنے اپنے علاقے تقسیم کیے تھے۔ایک مرکزی حکومت نہیں تھی۔ افغانستان میں مدد کرنے والے ممالک خاص طور پر مغربی ممالک اور امریکہ اپنے مفادات حاصل کرنے کے بعد افغان عوام اور افغانستان کو اسی طرح بے یارو مددگار اور مجاہدین کو آپس میں لڑتا چھوڑ گئے تھے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

طالبان کے آنے سے افغانستان کی صورت حال میں تبدیلی تو آتی ہے، لیکن ایک جبر کے ساتھ۔ اور اس میں طالب عبدالولی جو نفسیاتی طور پر ایک جھگڑالو طالب کماندان بن چکا ہوتا ہے، اور جب وہ اپنے دوست اللہ داد کے ساتھ بحث و تکرار کے بعد خود سے ہمکلام ہوتا ہے۔

" مزہ۔ عبدالولی خود سے ہمکلام ہوا۔ مزہ، میرا بس چلے تو اس مزہ لفظ کو کتاب سے نکال دوں۔ جس کسی نے ہماری زندگی سے مزے چھین لیے ہیں، انہیں بھی زندگی سے مزے لینے نہیں دونگا"۔

یہ وہ نفسیاتی کیفیت تھی جس نے طالب عبدالولی کو ہمدردی اور محبت کی دنیا سے دور نکال دیا تھا۔ اپنے دوست اللہ داد کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ چند دنوں کیلئے بھی اپنے گھر جانے اور ماں باپ کو دیکھنے کیلئے بھی رضامند نہیں ہوتا۔

ناول کے تیرہویں اور چودھویں باب میں طالبان کی حکومت چھائی رہتی ہے۔ ایک وسیع علاقے میں طالبان کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ گمشدہ افراد یا طالبان کی تلاش میں اُن کی ملاقات جیل میں قید ایک ایسے شخص سے ہوتی ہے جو انقلاب کا حامی ہوتا ہے۔ عاقل، بالغ اور سمجھدار، طالبان کی قید میں دیوانہ مشہور ہوتا ہے۔ وہ عبدالولی سے اپنی داستان بیان کرتا ہے۔ عبدالولی بھی اُس کو دماغی مریض سمجھتا ہے۔ جب اُس کے ایک سوال کے جواب میں وہ کہتا ہے،

" وہ اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ پیٹھ پیچھے اسلامی لباس میں وہ خفیہ قوتیں نظر آتی ہیں جنہیں یہ دیکھ نہیں سکتے۔ کام وہ کرتے ہیں، نام اِن کا استعمال ہوتا ہے۔ جو لوگ سوچتے ہیں اور اسطرح سوچتے ہیں انہیں قید کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح مجھے قید کیا گیا ہے"۔

اسی طرح سترہویں باب میں عبدالولی کے چچازاد بھائی سلیم کے اغوا ہونے اور اُسی کے ہاتھ دستیاب ہونے اور پھر اُس سے انتقام لینے اور اُس کو چھوڑ دینے میں عبدالولی جس ذہنی کیفیت سے گزرتا ہے وہ اُس کے نفسیات پر مکمل روشنی ڈالتی ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اور جب کہانی کا اختتام ہوتا ہے تو ایک اور حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔ طالب عبدالولی سمجھ نہیں پاتا کہ اُسے اب آگے کیا کرنا چاہیئے۔

افغانستان کی گزشتہ چالیس سالہ تاریخ نے اپنے واقعات اور حوادث کی روشنی میں کتنی کہانیاں جنم دے رکھی ہیں۔ اُسی کا ایک عکس آپ کو اس ناول میں اپنی کئی کیفیتوں کے ساتھ ملے گا۔ جسے حساس لوگ ہی سمجھ پاسکتے ہیں۔

ہماری طرف سے فاضل ناول نگار پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیماب اور مترجم نجیب اللہ زڑگئے علی خیل کو اس کاوش پر مبارک باد قبول ہو۔

عمر گل عسکر

نواں کلی، کوئٹہ

۱۱،۰۷،۲۰۱۷

(c) ketabton.com: The Digital Library

عرض مترجم

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے قلم سے آشنا کیا اور مجھے توفیق دی کہ میں اس قلم سے اپنے قوم، ملک اور زبان کی خدمت کر سکوں۔

محترم قارئین "طالب" ہمارے پشتون معاشرے کا ایک اہم کردار ہے جسے ہم اپنے غم، خوشی اور خاص مواقعوں پر ہی یاد کرتے ہیں۔ جیسے قرآن خوانی، فوتگی، نکاح، فاتحہ خوانی، یا پھر بچے کی پیدائش پر اُس کے کان میں آذان دینے کیلئے۔ مگر کبھی بھی ہم نے طالب کو اُس نظر سے نہیں دیکھا جس نظر سے ہم کسی سکول، کالج، یا پھر یونیورسٹی میں پڑھے جانے والے Studants یعنی جدید عصری تعلیم کے طالب کو دیکھتے ہیں۔ ہم اُن لوگوں کی بہت عزت کرتے ہیں جو فر فر انگلش بولتے ہیں۔ جینز پہنتے ہیں اور فیشن ایبل زندگی گزارتے ہیں۔ اور دوسری طرف ہمارے معاشرے کے اس اہم کردار کو جسے طالب کہا جاتا ہے سادہ لباس پہنتے، مسجد اور مدرسہ میں پڑھتے ہیں، روکی سوکھی روٹی سے گزارا کرتے اور علم کے متلاشی ہوتے ہیں۔ پھر اس سادہ لوح انسان کو عالمی قوتیں مذہب کے نام پر اکسا کر اپنے مخصوص مقاصد کیلئے استعمال کر کے پتہ نہیں کیا سے کیا بنا ڈالتے ہیں۔ مذہب کا یہ شیدائی کسی کی بھی باتوں میں آکر یہ نہیں دیکھتا کہ وہ کس لیے اور کس کیلئے استعمال ہو رہا ہے۔

انہی باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارے پشتو زبان کے نامور نقاد، افسانہ نگار اور ناول نگار جناب پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیماب نے طالب کی زندگی کو بھرپور انداز میں ناول کی صورت میں پیش کیا جسے عوام اور ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا اور دوسرا ایڈیشن تک چھپ گیا۔ اس معیار اور پزیرائی کو مد نظر رکھ کر میں نے پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیماب سے بات کی اور اُن کی اجازت سے اس ناول جس کا پشتو میں نام " طالبہ خدائے کہ بہ ٹلاشے!" ہے کو اُردو زبان میں "طالب!" کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس ناول میں آپ کو پشتو زبان کے ایسے الفاظ پڑھنے کو ملیں گے جو کہ پشتو زبان کے اپنے علاقائی الفاظ ہیں جن کا اُردو میں ترجمہ کرنا ذرا مشکل تھا۔ پر قارئین کی آسانی کیلئے اُن الفاظ کے تشریح نیچے حاشیہ میں دیے گئے ہیں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

آخر میں اُن احباب اور دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے نیک مشورے دیے اور اس ناول میں خصوصی دلچسپی ظاہر کی۔ خصوصاً ڈاکٹر عبدالرحمٰن نوید صاحب کا جنہوں نے اس ناول کی پروف ریڈینگ میں دن رات محنت کی اور جناب نامور شاعر و کالم نگار عمر گل عسکر صاحب کا جس نے اس ناول پر اپنا علمی نقطہ نظر آپ قارئین کے سامنے پیش کیا۔میرے قریبی دوست ایڈوکیٹ ظفراللہ بازئی، انجنیئر محی الدین کاکڑ، سید عصمت اللہ آغا، خدائے نور خان کاسی، سید نزیر خاکسار، شراف الدین کاکڑ، عبدالقادر کاکڑ، فضل الرحمٰن سنگریار اچکزئی، پہلوان نعمت اللہ علی خیل، عصمت اللہ علی خیل، چمپئین پہلوان عنایت اللہ علی خیل، واجد الرحمٰن رحمانی، راز محمد عرف داؤد بیانزئی، احسان اللہ تره کئی، پہلوان حفیظ اللہ تره کئی، ایمل خان مشوانی، عبداللہ مشوانی، نظام الدین مشوانی، محمد اصغر مشوانی ،عبدالعنان مشوانی، شہیم کاکڑ، خلیل خان کاکڑ، ڈاکٹر منظور احمد، شاہ محمد لانگو، ایڈوکیٹ آصف خان خلجی، ایڈوکیٹ قاسم خان خلجی، سید علی آغا، سید عباس شاہ مخلص ، علی محمد کاکڑ، اورنگزیب، احسان اللہ احسان، پروفیسر رئیس خان ، محترم سلیم بنگش صاحب ، حبیب اللہ کاکڑ صاحب ، لعل محمد اورکزئی صاحب ، رئیس ریحان منگل ، طاہر زلاند مندوخیل، محمد جعفر فٹبالر، باز خان المیار، ڈیزائنر خلیل اللہ تصمیم اور خصوصاً پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیماب صاحب کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے مجھے اس کتاب کو اُردو میں ترجمہ کرنے کی اجازت دی اور ساتھ ہی ساتھ ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی بھی کی۔اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو امن اور سلامتی کا گہوارہ بنائے، آمین۔ آپ سب قارئین کے روشن اور پُرامن مستقبل کا دعاگو۔ والسلام

نجیب اللہ زڑ گئے علی خیل

جنوبی پشتونخوا، ضلع کوئٹہ

۳۰،۰۷،۲۰۱۷

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۱)

وہ جیسے ہی اپنے گاؤں کے قریبی قبرستان کے ٹیلے پر پہنچا تو اُس نے محسوس کیا کہ قبرستان میں قبروں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔

عبدالولی، جسے یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ اُس کے گھر میں کوئی ہوگا بھی یا نہیں۔ وہ تو اُس جواری کی طرح تھا جو اپنا سب کچھ ہار چکا ہو، سب کچھ۔ ایک ایسا احساس جو وہ اپنے ساتھ جاتے ہوئے لے گیا تھا، مگر حالات کے تھپیڑوں نے اُسے ایک فقیر کی شکل میں واپس اپنے گاؤں بھیجا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی وہ چمک جو وہ بچپن میں اپنے ساتھ لے گیا تھا ماند پڑ گئی تھی۔

عبدالولی، اس سوچ میں تھا کہ گھر کے افراد اُسے پہچان بھی لیں گے یا نہیں۔ ماں، وہ پیاری ماں، جس کے قدموں تلے جنت ہے، کیا وہ مجھے پہچان لیں گی؟ کیا ایسا تو نہیں کہ وہ اس دنیا میں نہیں؟ نہیں، نہیں، وہ ضرور زندہ ہوگی۔ مگر، اگر وہ زندہ ہو بھی تو کیا مجھے پہچان پائیں گی؟

عبدالولی، جس نے اپنے وطن اور ملت کیلئے ایک لمبا سفر طے کیا تھا۔ وہ بھی اِس خاطر کہ اُس کے اِس کانٹے دار سفر سے میرا وطن تمام مصائب سے چھٹکارا پا سکے گا۔ وہ اسی سوچ میں قبرستان کے ٹیلے پر کھڑا گاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دو تین قدم چلنے کے بعد عبدالولی نے پہلے سڑک اور پھر اپنے پاؤں کے نیچے کی مٹی کو دیکھا، اُس نے زمین کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور مٹی اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے وہ مٹی کو چومنے لگا اور پھر اُسے اپنی آنکھوں سے لگانا شروع کیا۔ ایسے جیسے متبرک کتاب کے متبرک اوراق کو لوگ احتراماً چومتے ہیں۔ مُڑ کر قبرستان کو دیکھا، آنکھوں میں آنسو اُبل پڑے۔ دل میں ایک ٹیس سی محسوس کی اور ساتھ ہی اس خیال نے اُسے آگھیرا کہ خدا نہ کرے کہ میری ماں اِس قبرستان کی کسی قبر میں ابدی نیند سو رہی ہو؟ اِس خیال سے عبدالولی کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ مٹی سے بھری مُٹھی کھل گئی اور مٹی واپس گرد کی شکل میں زمین پر پھیل گئی۔ عبدالولی سب کچھ بھول چکا تھا، وطن کی محبت، دین کی

(c) ketabton.com: The Digital Library

محبت، زر قا• کی محبت، باپ بھائیوں کی محبت، وہ سب کچھ، سب کی محبت بھول چکا تھا۔ جو وہ بھول نہیں پارہا تھاوہ تھی ماں کی محبت۔

اُس کی لاکھ کوشش کے باوجود ماں کی محبت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ اُس کا لوگوں سے اعتبار اُٹھ چکا تھا۔ نہ ہی اُسے رشتہ داروں پر اعتبار تھا نہ ہی اُسے اپنی محبت پر اور نہ ہی اُسے اپنے آپ پر اعتبار تھا۔

جس پر اعتبار کیا تھا انہی لوگوں نے اُسے دھوکہ دیا تھا۔ اُس نے ہر قدم پر دھوکے کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ اُس کی زندگی فریب در فریب کھانے سے تاریک بن چکی تھی۔ مگر اِس تاریکی میں کہیں دُور آسمان پر ایک چمکتا دھمکتا ستارہ نظر آرہا تھا۔ یہ ستارہ عبدالولی کی ماں کی محبت کا ستارہ تھا، جس کے احساس نے عبدالولی کو اب تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ اِس احساس پر کہ ایک نہ ایک دن میں اِس ستارے تک ضرور پہنچونگا۔ اور اِسی احساس کی وجہ سے آج عبدالولی اُس ٹیلے پر کھڑا تھا جس پر وہ آج سے ۲۵ برس پہلے ۱۰ سال کی عمر میں اُس سفر پر روانہ ہوا تھا جس سفر میں اُسے ہر اُس بند گلی کا سامنا کرنا پڑا جس سے اُس کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اُس ٹیلے پر اُسی طرح کھڑا تھا جیسے وہ ابھی ابھی اس ٹیلے سے، اُس تھکا دینے والی سفر کیلئے روانہ ہوا تھا۔

• **زر قا:** پشتو زبان میں مادہ چکور یعنی چکوری کو کہتے ہیں۔ عام طور پر پشتونوں میں یہ نام لڑکیوں کیلئے کافی زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۲)

کتنی بار کہا کہ آج روٹی نہیں پکائی، جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ جب دیکھو منہ لٹکائے دروازے میں کھڑا رہتا ہے۔

کل بھی آپ نے روٹی نہیں دی۔۔۔۔۔ میں تھوڑی دیر بعد آجاؤں گا۔۔۔۔

ضرورت نہیں دوبارہ آنے کی۔۔۔۔۔ ہمارے گھر میں خود مہمان ہیں۔ عورت نے بچے کو حقارت سے جواب دیا۔

نہیں خالہ۔۔۔۔۔ مجھے مولوی صاحب پھر ماریں گے، وہ کہتے ہیں تم روٹی نہیں لاتے۔

تم جاتے ہو یا میں مولوی بن جاؤں۔ اتنا ماروں گی کہ نانی یاد آجائے گی۔ عورت نے چھوٹے بچے کو، جو کہ پاس ہی کہ مدرسے کا طالب تھا بھگا دیا۔

اس چھوٹے طالب کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے مدرسے جہاں وہ پڑھتا تھا کیلئے اور مولوی صاحب جو مدرسہ کے مہتمم اور مسجد کے پیش امام تھے کے گھر کیلئے گاؤں کے ہر گھر جا کر روٹی سالن اکٹھا کرے۔ جب کبھی بھی یہ وظیفے • کم پڑ جاتے تو مدرسہ کے بڑے طالبان کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب کے گھر میں بھی اُس کی شامت آجاتی۔ جس دن اُس کے اکھٹے کیے ہوئے وظیفے کم ہوتے بڑے طالب اُس دن اُسے روٹی کا ایک نوالہ بھی نہیں دیتے۔

• وظیفہ: مسجد یا پھر چھوٹے مدارس کا ایک نو عمر طالب مسجد کے آس پاس کے گھروں میں جا کر مسجد یا پھر مدرسہ کے طالبان اور امامِ مسجد کے گھر کیلئے سالن اور روٹی اکھٹا کرتا ہے۔ پاکستان کے پشتون علاقوں اور پورے افغانستان میں یہ رواج ہے۔ تاریخ مذاہب کے حوالے سے یہ رواج بدھ مذہب میں گوتم بدھ (پیدائش: ۵۶۰ق م یا ۵۶۵ق م)(وفات: ۴۸۰ق،م یا ۴۸۸ق،م) کی زندگی سے اب تک رائج ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

آج بھی اُس کے اکھٹے کیے ہوئے وظیفے کم تھے۔ لسی کی بالٹی میں گاؤں کے ایک بچے نے مٹی ڈال دی تھی۔ چھوٹا طالب اس وہم میں تھا کہ آج پھر اُس کی خیر نہیں۔ آہستہ آہستہ قدموں سے مدرسے کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

جلدی آؤ۔۔۔۔۔۔ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ کبھی بھی تم وقت پر نہیں پہنچے۔۔۔۔۔۔ سارا دن تم ہو اور تمھاری کھیل کھود۔ ایک بڑے طالب نے اُسے غصے سے کہا۔

جاؤ، دوسرے حجرے • سے گلاس لے آؤ اور اُس میں لسی ڈال دو اور روٹی کو دستر خوان میں رکھ دو۔ ایک اور بڑے طالب نے کہا۔

چھوٹا طالب دوسرے حجرے میں چلا گیا وہاں بھی ایک بڑا طالب بیٹھا کسی دینی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا، چھوٹا طالب ڈر کے مارے لسی کی بالٹی ایک طرف رکھ کر روٹی کی چادر جس میں اُس نے گاؤں کے ہر گھر سے وظیفے اکھٹے کیے تھے بڑے طالب کے قریب رکھ دی۔

مولوی صاحب کے گھر میں روٹی دی یا نہیں؟ بڑے طالب نے بغیر کتاب سے آنکھ ہٹائے چھوٹے طالب سے پوچھا۔

نہیں، نہیں دی۔ چھوٹے طالب نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔

تو پھر یہ روٹی کیوں کم ہے؟ بڑے طالب نے پیار سے پوچھا۔

میں کیا کروں۔۔۔۔ گاؤں کے تمام گھروں کو جاتا ہوں، کوئی کہتا ہے ابھی تک نہیں پکائی۔ کوئی کہتا ہے کہ گھر میں مہمان ہیں۔

• **حجرہ:** جہاں طالب اُٹھتے، بیٹھتے اور سوتے ہیں۔ خیبر پشتونخوا اور افغانستان کے کچھ علاقوں میں بیٹھک کو حجرہ کہتے ہیں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اسی اثناء میں وہ دونو ں بڑے طالب جو باہر بیٹھے تھے اندر کمرے میں داخل ہوئے۔ایک طالب کے بال بڑے، داڑھی لمبی، سر پر ایک بڑا سیاہ عمامہ جیسے وہ کسی تنظیم کا سربراہ ہو لسی کی بالٹی پر نظر پڑ جاتی ہے۔ یک دم وہ چھوٹے طالب کی گردن پر تھپڑ مار دیتا ہے۔ اس تھپڑ سے چھوٹے طالب کے مُنہ سے بے اختیار ایک ایسی چیخ نکلتی ہے جیسے اُسے گولی لگ گئی ہو۔

کیا ہوا؟ کیوں مار رہے ہو؟ کتاب کے سامنے بیٹھے طالب نے دوسرے بڑے طالب سے پوچھا۔

کیوں نہ ماروں، تم ذرا یہ لسی کی بالٹی تو دیکھو۔

کیوں کیا ہوا ہے لسی کو؟

وہ گاؤں کے ایک لڑکے نے اس میں مٹی ڈال دی۔ چھوٹے طالب نے روتے روتے جواب دیا۔

کیا کہا؟ کیوں یہ نہیں کہتے کہ تم خود بیکار ہو۔ سارا دن تم گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے رہتے ہو۔

مولوی اعظم حوصلہ رکھو۔ بچہ ہے، آہستہ آہستہ سمجھ جائے گا۔۔۔۔ کتاب والے طالب نے لمبے بالوں والے طالب کو تسلی دی۔

اس نے مار نہیں کھائی، ماں کی گھود میں نازو سے پلا بڑا ہے۔ ہم بھی بچے تھے، مگر اتنے ہڈ حرام نہیں تھے جتنا یہ ہے۔۔۔ اسی بات کے ساتھ پھر بڑے طالب نے چھوٹے طالب کی گردن پر تھپڑ رسید کر دیا۔

مولوی اعظم صاحب! چھوڑ دو بچے کو، غلطیاں ہم سے بھی ہوئی تھیں، جب ہم بچے تھے۔۔۔ چھوڑ دو ہم نے محنت اور خواری بھی تو کی ہے۔ مولوی اعظم نے جواب دیا۔

جاؤ ملک صاحب کے گھر سے لسی لے آو۔ مولوی اعظم نے چھوٹے طالب کو دروازے کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

چھوٹا طالب روتا ہوا مدرسہ سے جس میں ایک مسجد بھی تھی، ملک صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

یہ چھوٹا طالب عبدالولی تھا۔ جس کی عمر تقریباً سات سے آٹھ سال کے قریب تھی۔ گھر میں چار بھائی او دو بہنیں تھیں۔ والد گھر کا گزارا بڑی مشکل سے کرتا تھا۔ وہ دن بھر مزدوری کرتا اور اپنے چھ بچوں اور ایک بیمار بیوی کا پیٹ پالتا تھا۔ کبھی گھر میں چولہا جلتا تو کبھی فاقہ کشی ہوتی۔ عبدالولی کے بھائیوں اور بہنوں کی جسمانی حالت ایسی تھی جیسے انہیں کھانے میں صرف ہوا اور پانی میسر ہوتا۔ گھر تھا مگر گھر کے نام پر کھنڈر نما دیواریں اور کمرے تھے۔ دو ہی تو کمرے تھے۔ اُس گھر، جس کے ایک کمرے کا دروازہ نہیں تھا اور دوسرے کمرے کا ایک کواڑ تھا تو دوسرا غائب، کمرے ایسے جس کی چھتیں گرنے کو تھیں۔ سردیوں میں سرد اور گرمیوں میں گرم۔ یعنی وہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے ساتھ ایک کھنڈر میں رہتا تھا۔ داد محمد پہلوان، عبدالولی کا والد سارا دن اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کیلئے محنت مزدوری کرتا وہ بھی اگر مل جاتی تو۔ داد محمد کا ایک بھائی جو اُس سے عمر میں چھوٹا تھا لعل محمد نام تھا۔ وہ دونوں سگے بھائی تھے، مگر لوگوں کا خیال تھا کہ ایک دوسرے کے دُور کے رشتہ دار ہونگے۔ باپ نے اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد کا بٹوارہ دونوں بھائیوں میں کیا تھا۔ باپ کے گزر جانے کے فوراً بعد دونوں علیحدہ ہوگئے۔ داد محمد پہلوان کو باپ نے خوشی خوشی زمینداری حصے میں دی تھی۔ داد محمد پہلوان کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ زمینداری سنبھالے۔ اُسے حصے میں ایک کاریز• بھی ملی تھی۔ کاشت کاری کیلئے زمین اور پانی لعل محمد سے زیادہ اُس کے حصے میں آئیں تھیں۔ لعل محمد کو کچھ زمین اور اسی کاریز سے ایک وقت کا پانی باپ نے حصے میں دیا۔ مگر جس چیز نے آگے چل کر اس کے بچوں کا مستقبل تابناک بنایا وہ تھی

• کاریز: زمین کے نیچے قدرتی پانی کا ایک مصنوعی راستہ۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ایک دکان، جو لعل محمد کو باپ نے وراثت میں دی تھی۔ گاؤں سے تقریباً بیس کلو میٹر کے فاصلے پر شہر میں واقع اس دکان کا مالک لعل محمد بنا۔

وقت گزر تا گیا، حالات نے دوسرا رُخ اختیار کیا۔ خشک سالی آئی، اور ایسی آئی کہ پانی کا نام و نشان تک نہ رہا۔ کاریزات، چشمے، سب خشک ہوگئے، داد محمد پہلوان کو نقصان پر نقصان اُٹھانا پڑا۔ آخر مجبور ہو کر اُس نے تھوڑی تھوڑی زمین بیچنی شروع کر دی۔ لعل محمد نے دکانداری میں نام کمانا شروع کیا۔ تھوڑے سے عرصے میں لعل محمد مالی طور پر اتنا مستحکم ہوا کہ اُس نے اپنے بھائی کی زمینیں جو وہ بیچ چکا تھا واپس خریدیں۔ دونوں بھائیوں کے گھر ایک ہی گلی میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ داد محمد پہلوان کے گھر کا دروازہ نہیں تھا، مگر لعل محمد کے گیٹ جیسا پورے گاؤں میں نہیں تھا۔ داد محمد پہلوان، لعل محمد سے عمر میں بڑا تھا مگر لعل محمد اپنے آپ کو بڑا سمجھتا۔ داد محمد پہلوان بھی اُسے بڑا سمجھتا۔ لعل محمد اپنے بڑے بھائی کو بھائی کی نظر سے نہیں بلکہ ایک غریب ہمسائے کی نظر سے دیکھتا۔ لعل محمد اپنے بچوں کو ہمیشہ یہی تلقین کرتا کہ پہلوان کے بچوں کے ساتھ زیادہ کھیل کود مت کرنا۔ اُس نے اپنے دادا کی جائیدادیں بیچ دیں، خدا خبر کہ اُس کی اولاد کیا گل کھلائے گی۔ لعل محمد نے اپنے بڑے بیٹے سلیم کو سائیکل خرید کر دی تھی۔ جس پر وہ سکول آتا جاتا۔ سکول کے بعد شام کو وہ سائیکل پر گاؤں کے چکر لگاتا۔ سلیم کے دوست وہ تھے جن کی کچھ مالی حیثیت تھی۔ عبدالولی جتنا اُس کے قریب جاتا وہ اُتنا ہی اُس سے دُور رہتا۔ دُور رہنا تو اپنی جگہ وہ دوسرے دوستوں کے ساتھ ملکر عبدالولی کا مذاق اُڑاتا۔

داد محمد پہلوان جسے کسی چیز کی بھی فکر نہیں تھی، جس دن وہ رات کا نوالہ کماتا تو اُس دن اُس کی عید ہوتی۔ نہ اُسے بچوں کے کپڑوں کا خیال اور نہ ہی جوتوں کا خیال۔ اگر خیال تھا تو اُس کی بیوی کو تھا۔ وہ کپڑے سیتی اور بچوں کیلئے کپڑوں اور جوتوں کا انتظام کرتی۔ مگر آجکل وہ بھی بیمار بیمار سی رہنے لگی تھی۔ صرف کڑھائی کا کام جو کہ تھوڑا آسان بھی تھا کرتی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

بچوں کی فطرت ایسی ہوتی ہے کہ وہ باپ سے زیادہ ماں کے قریب ہوتے ہیں۔ وہ باپ کے سامنے بلا جھجک بات نہیں کرسکتے مگر ماں سے اپنی ہر خواہش کا اظہار بلا تامل کرتے ہیں۔ عبدالولی جب چھوٹا تھا تو اس کی ماں خال دارہ کا بھی دل چاہ رہا تھا کہ وہ اُسے بھی کسی سکول میں داخل کروائے۔ وہ بھی سکول جاکر تعلیم حاصل کرے، جیسے اُس کے چچیرے بھائی جاتے ہیں۔ یہ ارمان ایسا پورا ہوا کہ عبدالولی سکول کی بجائے درس و تدریس کیلئے مدرسہ میں داخل ہوا۔ عبدالولی کی خواہش جو اُسے دل ہی دل میں کھائے جارہی تھی یہ تھی کہ وہ بھی اپنے چچیرے بھائیوں کی طرح سکول جائے۔ اُس کے پاس بھی ایک سائیکل ہو، وہ بھی اچھے اچھے کپڑے پہنے، مگر یہ ایک ایسا خواب تھا جس کی تعبیر عبدالولی کو نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود عبدالولی بااحساس اور ہونہار لڑکا تھا۔ داد محمد پہلوان کے بھائی لعل محمد کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ سلیم بڑا لڑکا تھا۔ لعل محمد گرچہ ناخواندہ تھا مگر وہ کچھ لکھ پڑھ سکتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد دونوں بھائیوں میں بٹوارہ ہوا۔ لعل محمد کا بیٹا سلیم عبدالولی سے دو سال چھوٹا تھا۔ لعل محمد کو وراثت میں ایک دکان جو کہ شہر میں تھی ملی تھی۔ وہ صبح دکان جاتا، اور شام کو واپس لوٹ آتا۔ کچھ عرصہ وہ بسوں میں جاتا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس نے ایک موٹر سائیکل خریدلی۔ اُس نے اپنے بڑے بیٹے سلیم کو بھی شہر کے ایک سکول میں داخل کروالیا جسے وہ اپنے ساتھ آتا لے جاتا۔ ترقی لعل محمد کے نصیب میں تھی، موٹر سائیکل سے وہ گاڑی کا مالک بن گیا۔ جیسے ہی دوسرا بیٹا چلنے پھرنے کے قابل ہوا اُسے بھی اپنے ساتھ شہر لے جاتا۔ کچھ عرصے کے بعد اُسے بھی شہر کے سکول میں داخل کروایا۔ لعل محمد کی بیوی ایک ایسی عورت تھی جو خود تو دُور اپنے شوہر کو بھی اُس کے بھائی کے گھر سے دُور رکھتی۔

خوشی کے موقع پر تو وہ داد محمد پہلوان اور اُن کی بیوی بچوں سے ایسا کام لیتی جیسے وہ اُن کے اپنے نہیں بلکہ کرائے کے مزدور ہوں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ایک دن عبدالولی مسجد کے پیش امام سے قاعدہ کا درس لے رہا تھا کہ پیش امام نے عبدالولی کے والد داد محمد پہلوان کو کہلا بھیجا کہ وہ اُن سے آ کر مل لیں۔

پہلوان! تمھارا یہ بیٹا ماشااللہ بہت ہی ذہین ہے۔ تم اسے اللہ کی راہ میں بھیجو، میرا مطلب اسے کسی بڑے مدرسہ میں داخل کراؤ۔

مولوی صاحب! مجھ بیچارے کو اپنی نماز کا صحیح پتہ نہیں اور نہ ہی میں نے آج تک نزدیک کے بازار کو صحیح دیکھا ہے، میں کہاں مدرسے ڈھونڈتا پھرونگا۔

مجھے ایک جگہ معلوم ہے، ہمارے پاس کے گاؤں میں ایک بڑی مسجد ہے جہاں ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی ہے۔ گاؤں کے بچے بچیاں وہاں پڑھنے آتے ہیں، میں عبدالولی کو وہاں بھیج دونگا۔ عبدالولی وہاں بڑے طالبان • کیلیئے گھروں سے وظیفہ بھی اکھٹا کرے گا۔اور سبق کا سلسلہ بھی چلتا رہے گا۔ تم پر تورات آتی ہے مگر صبح نہیں آتی۔

جیسے آپ کی مرضی مولوی صاحب۔ مگر اُس کی ماں۔۔۔۔۔۔

مگر اُس کی ماں۔۔۔۔ شرم کرو، مرد بنو، اُس سے پہلے کہ داد محمد کچھ کہتا مولوی صاحب نے اپنی آنکھیں سرخ کر دیں۔

اب عورتیں فیصلے کریں گی۔ بہت ہی بیوقوف ہو۔ جاؤ جو تمھاری بیوی کہتی ہے وہی کرو۔ یہ کہتے ہی مولوی صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مولوی صاحب! آپ تو بلا وجہ ناراض ہو گئے۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ داد محمد نے مولوی صاحب کی منت سماجت شروع کر دی۔

تو پھر تمھارے کہنے کا مطلب کیا ہے جو تمھیں خدا اور اُس کے رسول ﷺ کی بتائے ہوئے طریقے بتاتا ہے وہی ملامت ہوتا ہے۔ مولوی صاحب اُسی طرح غصے میں تھے۔

• **طالبان:** دینی علوم حاصل کرنے والے طالب علموں کو مقامی پشتو زبان میں طالبان کہتے ہیں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

توبہ ہے میری توبہ۔۔۔۔ میرے باپ کی بھی توبہ۔ داد محمد اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے۔

تو پھر ٹھیک ہے، کل اُس کے کپڑے کسی گٹھڑی میں باندھ کر اُسے میرے پاس بھیج دو۔ مولوی صاحب یہ کہتے ہوئے روانہ ہو جاتے ہیں۔

ٹھیک ہے مولوی صاحب، جیسا آپ کہتے ہیں ویسا ہی ہو گا۔

داد محمد پہلوان کا گاؤں آبادی کے لحاظ سے چھوٹا تھا۔ تقریباً پچاس ساٹھ گھر تھے۔ گاؤں میں ایک مسجد تھی جس میں ایک پیش امام۔ پیش امام کیلئے گاؤں کے لوگوں نے مسجد کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا گھر بنا کر دیا تھا جس میں پیش امام اپنے بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ مسجد میں بڑا بیٹا بچوں کو درس دیتا اور چھوٹا بیٹا ہر شام گھر کیلئے وظیفہ اکھٹا کرتا۔

مسجد کے سامنے صاف پانی کا ایک نالہ بہتا تھا، جو کہ اصل میں کاریز کا پانی تھا۔ اب اُس نالہ میں پانی نہیں بہہ رہا تھا۔ کاریز خشک ہو گئے تھے۔ نالے کے کنارے توت کے درختوں کے قطار کھڑے تھے۔ جو کہ اُسی پانی سے سیر اب ہوتے، مگر آجکل توت بھی پیاسے نظر آرہے تھے، سردیوں میں، یہ صاف پانی کا نالہ پھر بھر جاتا تھا۔ توت کے درخت سردیوں میں اپنی پیاس بجاتے اور گرمیوں میں پھر پیاسے باران رحمت کے منتظر رہتے۔

جب کسی وقت اس نالہ میں پانی کافی مقدار میں بہہ رہا تھا تو لوگ نالہ کے کنارے توت کے درخت کے سائے میں آرام کرتے۔ اسی نالہ سے پینے اور وضو کا پانی استعمال میں لاتے۔ اسی نالہ پر مرد حضرات غسل بھی کیا کرتے، یعنی یہ نالہ پورے گاؤں کے مردوں کیلئے حمام کی حیثیت رکھتا تھا۔ عورتوں کیلئے نالہ پر تھوڑا اوپر کی طرف پانی بھرنے اور کپڑے دھونے کیلئے جگہیں بنائی گئیں تھیں۔

عصر کی نماز کے بعد گاؤں کے عمر رسیدہ بزرگ افراد مسجد کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لگاتے۔ بعض لوگ مسجد سے کچھ دور بیٹھ کر دیسی شطرنج جو کہ زمین پر بنائی جاتی، کھیلتے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اب جبکہ کاریز خشک ہو گئی تھی تو یہ تمام سلسلے بھی ختم ہو گئے تھے۔ اب نہ وہاں لوگوں کے جمگھٹے تھے اور نہ ہی ٹھنڈا پانی۔ جن لوگوں کی مالی حیثیت کچھ ٹھیک تھی انہوں نے اپنے لیے ٹیوب ویل لگوا لیے تھے۔ اور جن لوگوں کی مالی حیثیت کمزور تھی انہوں نے ٹیوب ویل کے مالکان سے زمینوں کی کاشت کاری کیلیئے پانی کا ایک حصہ اجارے پر لیا تھا۔ تمام گاؤں میں دس یا پندرہ ایسے افراد تھے جو کہ مالی لحاظ سے مستحکم تھے۔ باقی تمام داد محمد پہلوان کی طرح گزارے پر اکتفا کرتے۔ گاؤں کے ساتھ ہی شہر کیلیئے ایک پکی سڑک جاتی تھی۔ گاؤں کے لوگوں نے سڑک کے کنارے ایک اڈہ بھی بنالیا تھا جہاں عطاء قصاب کی دکان تھی۔ عطاء قصاب شہر سے گوشت لاکر گاؤں میں بیچتا۔ دوسرے گاؤں کی بسیں اِس اڈے پر رُکتیں۔ گاؤں میں تقریباً پندرہ سے بیس ایسے گھر تھے جن کے دروازے تھے۔ باقی تمام گھروں کے دروازے نہیں تھے۔ پورے گاؤں میں صرف ایک ہی دکان تھی جو کہ خیرو پونگی کے نام سے مشہور تھی۔ ایک ہی پرائمری سکول تھا جہاں صاحب حیثیت لوگوں کے بچے پڑھنے جاتے۔ سکول کے بچوں سے زیادہ بچے مسجد قاعدہ پڑھنے جاتے۔ جو بچے مسجد پڑھنے نہیں جاتے تو والدین انہیں بُرا بلا کہتے۔ مگر سکول کے معاملے پر خاموش رہتے۔ سکول میں صرف دو استاد (ماسٹر) تھے جو کہ دوپہر کے قریب تھوڑی دیر کیلیئے آتے اور باقی سارا دن اپنی زمینوں میں کاشت کاری کرتے۔ جیسے ہی سکول پہنچتے تو کسی بچے کو چائے لانے کیلیئے بھیجتے۔ پھر اُس کے بعد تھوڑی دیر سبق اور پھر لسی کا دور چلتا۔ پڑھائی سے زیادہ سکول میں کھانے پینے کا رواج تھا۔

خال دارہ، جس کے جگر کا ٹکڑا اُس سے جدا کیا جا رہا تھا، پہلوان کی بیوی تھی۔ وہ ناچاہتے ہوئے بھی اپنے شوہر پہلوان کے فیصلے کے آگے مجبور تھی۔ دل پر بوجھ رکھے اُس نے عبدالولی کے کپڑوں کی ایک چھوٹی گھٹڑی تیار کر کے عبدالولی کو چوما۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے صحن تک اُس کے ساتھ آئی۔ آنکھوں میں آنسو لیے اپنے بیٹے کو باپ کے حوالے کیا۔ پہلوان عبدالولی کو لیکر سیدھا مولوی صاحب کے پاس لے گیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

دوماہ گزر گئے کہ عبدالولی کو اس مدرسہ نمامسجد میں آئے ہوئے۔ گاؤں کے ہر گھر سے واقف ہو چکا تھا۔ دوپہر کو گاؤں کے ایک حصے سے اور شام کو دوسرے حصے سے وظیفے اکٹھے کرتا۔

صبح سویرے قرآن گود میں گاؤں کے بچوں کے ساتھ پڑھنے بیٹھ جاتا۔ برتن دھونا، وظیفے اکٹھے کرنا، جھاڑو پوچھا لگانا یہ سب عبدالولی کے تمام دن کے کام کاج میں تھا۔ مگر پڑھائی وہ تو صرف نام کی تھی۔ عبدالولی کا دل نہیں چاہتا کہ وہ مدرسہ میں رات گزارے، گھر کے افراد ماں، بھائی، بہن خاص طور پر سب سے چھوٹی بہن گل پانڑا بہت یاد آتی۔ رات کو اپنے بستر میں چھپ کر رونا اور روتے روتے سو جانا عبدالولی کا معمول بن گیا تھا۔ صبح سویرے جاگنا، بڑے طالبان کے لئے چائے بنانا جو کہ اس مدرسہ نمامسجد میں مولوی سے درس لیتے تھے اور پھر شام کو گاؤں کے بچوں کو بھی پڑھاتے تھے۔ عبدالولی ان کے خدمت میں لگ جاتا۔

گاؤں کے لوگ ان طلباء کو کبھی کبھی جیب خرچ بھی دیتے۔ مولوی صاحب کو زکوۃ، خیرات، صدقات ملتی۔ وظیفے سے جمع کی گئی روٹی کو سوکھا کر وہ بیچ دیتے اور وہ روپے مولوی صاحب اپنے پاس رکھتے۔ عبدالولی کا ناشتہ سوکھی روٹی اور چائے کے ساتھ تھا۔ پھر قرآن مجید لے کر وہ مسجد یا مسجد کے صحن میں بیٹھ جاتا۔ ایک بڑا طالب اُسے درس دیتا۔ کچھ دیر بعد گاؤں کے بچے آتے تو عبدالولی ان کے ساتھ مل کر پڑھتا، گاؤں کے ان بچوں میں ایک بچی جس کا نام زرقا تھا گاؤں کے ملک صاحب کی بیٹی تھی۔ بڑے طالب کو سبق سنانے سے پہلے وہ عبدالولی سے پوچھتی، اکثر اوقات اُسے سبق یاد نہیں رہتا۔ اس لیے وہ عبدالولی کے پاس ہی بیٹھتی۔ زرقا کبھی کبھی کھانے کی کوئی چیز اپنے ساتھ لے آتی تو عبدالولی کے ساتھ مل بانٹ کر کھاتی۔ جب عبدالولی زرقا کے گھر وظیفہ لینے جاتا تو زرقا اپنی ماں سے کہتی کہ یہ طالب بہت اچھا ہے۔ جب بھی مجھے سبق یاد نہیں ہوتا یہ مجھے یاد کراتا ہے۔ زرقا کی ماں بھی عبدالولی کے ساتھ پیار اور محبت سے پیش آتی۔ اس پیار و محبت کی وجہ سے عبدالولی کو اپنی ماں کی یاد بہت ستاتی۔ عبدالولی کی زندگی بھی عجیب زندگی

(c) ketabton.com: The Digital Library

تھی۔ وہ پیار و محبت سینے میں لیے جب وظیفے اکٹھے کر کے مسجد کی طرف روانہ ہوتا گاؤں کے بچے پیچھے سے نعرے لگاتے۔

طالب جب وظیفے اکٹھے کرلیتا ہے

مُنہ تھیلا بنالیتا ہے

پیٹ بوری بنالیتا ہے

خدا کرے کہ طالب مر جائے۔

عبد الولی ان بچوں کے ساتھ لڑتا، کبھی اس لڑائی میں سر زخمی تو کبھی مُنہ سے خون بہنے لگتا۔ مسجد پہنچ کر بڑے طالب اُسے ڈانٹتے، پیٹتے۔ عبد الولی نے بھی بچوں سے لڑنا بند کر دیا، اور اُن بچوں کی نشاندہی کر تا جو اُسے تنگ کرتے۔ مسجد میں وہ بڑے طالبان سے اِن بچوں کی شکایت کر تا۔ بڑے طالب اُن بچوں کو سزا دیتے، گاؤں کی اکثر عورتیں عبد الولی کو بد دعائیں دیتیں۔

" کمبخت! ہم نے توا گرم کیا بھی نہیں ہوتا کہ تم سر پر کھڑے ہو جاتے ہو"۔ بعض گھروں میں عبد الولی کی ہم عمر لڑکیاں عبد الولی کو تنگ کرتی۔ کبھی ٹوپی تو کبھی جوتے چپالیتیں۔ یا پھر دور پھینک دیتیں۔ گاؤں کے کتے تو عبد الولی کے جانی دشمن بن گئے تھے۔

ننھا عبد الولی سبق کے نام پر زندگی کے ہر موڑ پر جنگ جیسی حالت کا سامنا کر رہا تھا۔ پر دیسی کی جنگ، اپنے بس سے زیادہ کام کی جنگ، اور زیادہ تر لوگوں کی نفرت کے ساتھ جنگ۔ یہ وہ اُتار چڑھاؤ تھے جو عبد الولی کی زندگی میں جنگ جیسی حالت کا سبب بن رہے تھے۔ پورے گاؤں میں اُس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ ماسوائے زرقا اور اُس کی ماں کے۔ جو کہ ہر وقت عبد الولی کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آتے۔

جب کبھی بھی گاؤں میں فوتگی ہوتی تو عبد الولی وہاں خیرات کی گئی کھجور زرقا کے لیے چھپاتا۔ عبد الولی زرقا کو جب کھجور دیتا تو وہ پوچھتی کہ یہ کیا ہے اور تمھارے پاس کہاں سے آئی؟ عبد الولی کہتا کہ گاؤں میں فوتگی ہوئی تھی وہاں سے لایا ہوں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

نہیں، میں یہ نہیں لوں گی۔

کیوں؟

امی کہتی ہے کہ فوتگی کی خیرات کھانا اچھا نہیں ہوتا۔

کیوں اچھا نہیں ہوتا؟ میں بھی تو کھا رہا ہوں، مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔

مجھے پتہ نہیں، بس امی کہتی ہے۔

پھر وہ عبدالولی سے کھجور لے لیتی۔ زرقا کو جب والد چیزیں خریدنے کیلئے پیسے دیتا تو زرقا ان پیسوں سے پاپڑ اور کھانے کی چیزیں خرید لیتی، ان چیزوں میں عبدالولی کا حصہ ضرور ہوتا۔ جب کبھی عبدالولی زرقا کے گھر وظیفہ لینے جاتا تو زرقا وہ چیزیں عبدالولی کو دیتی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر بڑے طالب عبدالولی کو مارتے، پیٹتے کہ یہ تم ہماری جیبوں سے پیسے چُرا کر خریدتے ہو۔ عبدالولی جسے جس مقصد کیلئے باپ نے بھیجا تھا وہ اُس کی بجائے خدمت کرنے میں مصروف تھا۔ مہینے میں صرف ایک مرتبہ وہ جمعرات کی شب گھر جاتا، باقی تین جمعے وہ مسجد میں گزارتا، جمعہ کی شب اکثر دوسرے مساجد کے طالبان اُن کے مسجد بانڈار (محفل) سجانے آتے۔ یا پھر عبدالولی کے مسجد کے بڑے طالبان وہاں جاتے۔ طالبان کی محفل بڑی ہی دلفریب ہوا کرتی تھی۔ ایک جمعہ کی شب جب عبدالولی اس مسجد میں نیا نیا آیا تھا تو ایک محفل سجائی گئی تھی۔ قرب و جوار کی مسجدوں سے کافی طالبان آئے تھے۔ اس دن عبدالولی ہر ایک گھر سے دو دو روٹی وظیفہ لایا تھا۔ رات کو جب محفل سجی تو عبدالولی بھی اس محفل سے کافی محفوظ ہوا۔

ملا پائیدین اخوند جو اس طرح کی محفلوں کیلئے بہت مشہور تھے درمیانی داڑھی، بڑے عمر کے طالب تھے۔ گاؤں کے نوجوان عشاء کی نماز کے بعد مسجد کے ایک کمرے جسے حجرہ کہتے ہیں بڑی تعداد میں آئے۔ ایک طالب بڑا تھال لے کر بیٹھ گیا دوسرے طالب نے چادر سے بنا ایک بڑا ٹین کا ڈبا اٹھایا اور چار طالبان تالیاں بجاتے ہوئے ملا پائیدین اخوند نے اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ کلام کے پہلے اشعار کچھ اسطرح تھے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

بادشاہ نے کہا وزیروں میرے پہلوانوں

شیر کے ہاتھ باندھ دو اور اسے اس طرف کھینچ لاؤ

یہ سر اس کے تن سے جدا کرو

یہ کلام کے پہلے بول تھے جو تمام طالبان اسے تکرار کیا کرتے۔

جب پہلے بول بولے جاتے تو اس کے بعد ملا پائیدین اخوند اپنا کلام شروع کرتا۔ کافی دیر تک کلام گائے گئے۔ اس کے بعد عبدالولی بڑی کیتلی میں چائے لے آیا۔ چائے کے ساتھ ساتھ دیگر طالبان نے بادشاہ اور وزیر کا کھیل شروع کیا۔ ایک طالب جس نے بڈئی کے ذریعے فال نکالا وہ بادشاہ بنا۔ دوسرا وزیر۔ اسی طرح بڈئی• (ہڈی) سیدھی کھڑی ہو جاتی تو وہ گھوڑا یعنی بادشاہ کہلاتا۔ اگر نچلی سائیڈ پر کھڑی ہو جاتی تو وہ گدھا یعنی وزیر کہلاتا۔ اور اگر تیسرے رُخ پر پڑی رہتی تو بکری یعنی چور کہلاتی۔ جو طالب بھی چور بنتا تو وزیر اُسے بادشاہ کے سامنے یوں پیش کرتا۔

بادشاہ بادشاہ! چوری ہوئی۔

کس نے کی؟ بادشاہ نے پوچھا۔

فلانے نے کی۔ کسی کا نام لے لیتا۔

پکڑا گیا ہے؟ بادشاہ نے پوچھا۔

ہاں پکڑا گیا ہے! جناب عالی۔

سزا دے دو۔

کونسی؟

کمرے سے باہر نکل جائے اور کئی مرتبہ جلدی جلدی یہ کہے۔

کچہ پاپڑ پکہ پاپڑ، کچہ پاپڑ پکہ پاپڑ، کچہ پاپڑ پکہ پاپڑ، کچہ پاپڑ پکہ پاپڑ

• بڈئی: بکرے یا پھر دونبے کے پیر کی جوڑ کی ایک مخصوص چھوٹی ہڈی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

جب وہ یہ الفاظ جلدی جلدی کہتا تو اُس سے جلدبازی میں غلطی ہو جاتی جس پر تمام طلباء زور زور سے ہنستے، اسی طرح چور کو دُرے بھی پڑتے۔ وہ اپنے چادر سے ایک دُرا بناتے اور چور کے تلووں پر زور زور سے مارتے۔ گرچہ چور کو تکلیف ہوتی مگر شرم کے مارے وہ مُنہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتا۔ یہ کھیل اسی طرح تھوڑی دیر چلتا رہا پھر کھیل کے ختم ہونے پر محفل پھر سے جم جاتی۔ محفل کے دوران قہوہ چائے کا دور چلتا۔ اسی دوران گاؤں کے ایک نوجوان نے ملا پائیدین سے پوچھا کہ

ملا پائیدین اخوند! لوگ کہتے ہیں کہ پُرانے وقتوں کے طالبان اِس سے اچھی محفل سجاتے آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

بالکل صحیح کہتے ہیں۔ محفل تو اب صرف نام کی رہ گئی ہے۔ پچھلے دور میں طالبان صرف محفل ہی نہیں اور بھی بہت کچھ کیا کرتے تھے۔ آجکل تو وہ طالبان بھی نہیں رہے۔ پچھلے دور میں ایک گاؤں کے طالبان دوسرے گاؤں سے خشک گوشت (لاندی) چُرا کر لے آتے۔ ملا پائیدین نے جواب دیا۔

وہ کیسے؟ ایک دوسرے بیٹھے جوان نے پوچھا۔

وہ اس طرح کہ جب کسی گاؤں میں خشک گوشت بنایا جاتا تو دوسرے گاؤں کے طالبان اُس گاؤں کے طالبان سے کہتے کہ آپ لوگوں کے گاؤں میں فلاں کے گھر پر تین خوشے خشک گوشت بنا ہوا ہے ہم تین دنوں میں ایک خشک خوشہ چُرا کر اپنے گاؤں لے آئیں گے۔ آپ لوگوں کو خبر ہو۔

پھر اِس گاؤں کے طالبان جاتے اُس گھر سے ایک خوشہ چُرا لیتے۔ اگر وہ اپنی مسجد تک گوشت کا خشک خوشہ لے آتے تو وہ خشک گوشت کا خوشہ اِن کا ہو جاتا اور دوسرے گاؤں کے طالبان اِن کیلئے دعوت بھی کرتے۔ اور اگر پکڑے جاتے تو خشک گوشت کے خوشے کے ساتھ ساتھ جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا۔ اِس کھیل کے متعلق گاؤں کے لوگوں کو بھی پتہ ہوتا بلکہ گاؤں کے

(c) ketabton.com: The Digital Library

جوان بھی طالبان کے ساتھ اِس کھیل میں شریک ہوتے تھے۔ یہ کھیل عموماً موسم خزاں کی سرد اور چاندنی راتوں میں ہوا کرتا تھا۔

طالبان میلوں میں اپنے جھنڈے گاڑتے، وہ لوگ رقص کرتے، میلے کے تیسرے دن جب شام کو طالبان اپنا رقص کرتے تو اس کے ساتھ ہی میلہ بھی اختتام پزیر ہوتا۔

اب یہ سب کچھ کیوں نہیں ہوتا؟ نوجوان نے پوچھا۔

آجکل میلے کہاں ہیں۔ میلے تو گلستان اور چمن کے مشہور میلے تھے۔ اور بھی تھے مگر یہ دونو بہت مشہور تھے۔ دور دور سے لوگ یہ میلے دیکھنے کیلئے آتے، میں خود چمن کا میلہ دیکھنے بہت جاتا۔ یہ پشین ضلع میں ہوا کرتا تھا۔ ملکیار اور منزکی کے درمیان جو چھوٹی ندی ہے یہاں ہوا کرتا تھا۔ ارد گرد کے علاقوں کے لوگ تین دن تک نزدیک کے گاؤں میں میلہ دیکھنے کیلئے رہائش پزیر ہوتے۔ صبح وہ میلہ دیکھتے اور رات کسی نزدیک گھر میں گزارتے۔ میلے میں انڈے لڑائے جاتے، بڑے بڑے شامیانے کھڑے ہوتے، آخری دن پہلوانی ہوتی، گھوڑ دوڑ، وغیرہ وغیرہ۔ بہت کچھ ہوتا اب تو نہ میلے ہیں نہ وہ لوگ اور نہ وہ طالبان۔ آجکل تو میلوں کی بجائے فساد ہی فساد ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۳)

اِس جمعے کو عبد الولی تین ہفتوں کے بعد گھر آیا۔ چھوٹی بہن گل پانڑا کو گود میں لے کر چہرے کے ایک طرف اور دوسری طرف چومنے لگا۔ ماں کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور ماں نے بھی اُسے ماتھے پر چوما۔ گل پانڑا جو کہ اب دو سال کی ہو گئی تھی اُس کی گود میں بیٹھی تھی کہ ماں نے پوچھا۔

طالب! تم کیا کہہ رہے تھے؟

عبد الولی کو آجکل گھر میں طالب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

میں کہہ رہا تھا کہ میں مزید اس مسجد میں نہیں پڑھونگا، عبد الولی نے کہا۔ عبد الولی نے اس مسجد نما مدرسہ میں سال کے قریب وقت گزارا تھا۔

کیوں نہیں پڑھو گے، کیا ہوا؟ ماں نے پوچھا۔

یہاں تو صرف مجھ سے وظیفے اکٹھے کرائے جاتے ہیں یا پھر لسی جمع کرنی پڑتی ہے۔ عبد الولی نے کہا۔

تو کیا ہوا سبق بھی تو پڑھا رہے ہیں۔ ماں نے کہا۔

خاک سبق پڑھا رہے ہیں۔ بڑے طالب ہم پر بادشاہی کرتے ہیں، گھروں کے بچے تنگ کرتے ہیں، لڑائی کرتے ہیں، عورتیں تو ایسی ہیں جیسے میں اُن سے بھیک مانگتا ہوں۔ عبد الولی نے ماں کو اپنی مشکل بتادی۔

تو پھر کرو گے کیا جو سبق نہیں پڑھو گے؟۔ ماں نے پوچھا۔

سبق پڑھونگا مگر مدرسہ میں۔ وہاں ایک طالب کہہ رہا تھا کہ مدرسہ اس جگہ سے اچھا ہے، وہاں اچھا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

یہ بھی تو مدرسہ ہے۔ ماں نے کہا۔

کس نے کہا؟ مسجد ہے مدرسہ کہاں سے ہوا۔ عبد الولی نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مدرسہ میں اس طرح نہیں ہو گا؟ ماں نے پوچھا۔

مجھے پتہ نہیں کہ کیسے ہو گا، مگر اُس دن وہ طالب کہہ رہا تھا کہ مدرسہ مسجد سے اچھا ہے۔ بندہ صرف اپنی پڑھائی پر دھیان دیتا ہے۔ ماں! وہاں قرآن شریف زبانی یاد کرایا جاتا ہے۔ میں بھی قرآن شریف حفظ کرونگا۔ عبدالولی نے کہا۔

یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم قرآن شریف حفظ کرو، مگر پھر کیا کروگے؟ ماں نے پوچھا۔

کیا کرونگا، تراویح میں پڑھاؤں نگا۔ لوگوں کو قرآن شریف کی تراویح دونگا۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

میں قربان جاؤں۔ بیٹا قرآن شریف لوگ تراویح کیلئے حفظ نہیں کرتے، قرآن کو سمجھنے کیلئے حفظ کرتے ہیں تاکہ پھر دوسرے لوگوں کو سمجھائے۔ ماں نے کہا۔

تو پھر میں مدرسہ جاؤں؟ عبدالولی نے ماں سے پوچھا۔

تم ٹھہرو، تمھارے ابو آئیں تو وہ کیا کہتے ہیں۔

انہیں نہ کہیں، وہ پھر مولوی صاحب سے کہیں گے، مولوی صاحب نے تو اسی خدمت کیلئے مجھے مسجد بھیجا تھا۔ وہاں کا مولوی اِس مولوی کا دوست ہے۔ وہاں کوئی دوسرا چھوٹا طالب نہیں ہے جو وظیفے اکھٹی کر سکے۔ عبدالولی نے کہا۔

تم کیسے جاؤ گے، تمھیں مدرسہ کا پتہ معلوم ہے؟ ماں نے پوچھا۔

ہاں اُس دوسرے طالب کے ساتھ جاؤنگا، اُس نے مجھ سے کہا ہے۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

جیسے تمھاری مرضی، میں کیا کر سکتی ہوں۔ ماں راضی ہو گئی۔

دوسرے دن عبدالولی نے ماں سے رخصت لی اور چلا گیا۔ مسجد سے اپنا بستر چُھپا کر دوسرے بڑے طالب کے ساتھ مل کر مدرسہ کی جانب روانہ ہوا۔ یہ مدرسہ بڑے مدرسوں میں

(c) ketabton.com: The Digital Library

سے نہیں تھا، نسبتاً اُن سے تھوڑا چھوٹا تھا۔ دور دراز علاقے میں تھا اور ارد گرد کے گاؤں کے بچے بھی یہاں پڑھنے آتے تھے۔ ساٹھ کے قریب طالب یہاں رہائش پزیر تھے۔ یہاں سے عبد الولی کا گاؤں کافی دور تھا۔ مدرسہ عام سڑک سے بھی تین میل دور تھا۔ لیکن قریب ہی ایک دو گاؤں تھے۔ عبد الولی مدرسہ میں ۱۴ طالبان کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہ رہا تھا۔ مدرسہ میں کل دس کمرے تھے جن میں تین استادوں کے اور ایک کمرا جو کہ مہتمم کے گھر سے لگا ہوا تھا مہتمم کا تھا۔ بقیہ ہر کمرے میں اسی طرح کی تعداد سے طالب رہ رہے تھے۔ مدرسہ کے تمام کمرے جنہیں حجرہ بھی کہتے ہیں مٹی کے بنے کچے کمرے تھے۔ بانس اور چٹائی سے اُن کے چھت ڈھکے تھے۔ صحن کچا تھا۔ ہر کمرے میں طالبان کے بستر ے پڑے ہوتے جن کے سراہنے بکس، گٹھڑی (پوٹلی) پڑے ہوتے۔ جن میں طالبان کے کپڑے یا ضرورت کی اور اشیاء پڑی ہوتی۔ ایک چادر کی ٹینکی جس میں کچھ نلکے لگے ہوئے تھے مدرسہ کے ایک کونے میں پڑی ہوئی تھی۔ پینے کا پانی یہاں سے لیتے اور وضو بھی اسی ٹینکی سے کرتے۔ پورے مدرسہ میں دو استنجا خانے تھے۔ مگر بڑی حاجت کیلئے طالبان کو مدرسہ سے باہر دور میدان میں جانا پڑتا۔ وہ اس لیے کہ مدرسہ میں بیت الخلا کا انتظام نہیں تھا۔ جب کبھی غیر ارادتاً کسی سے بھی استنجا خانے میں بڑی حاجت ہو جاتی تو پھر چھوٹے طالبان کی خیر نہیں ہوتی۔ استاد اُن سے وہ استنجا خانے صاف کرواتے اور کان بھی پکڑوا لیتے۔ مدرسہ کی کمروں میں نہ تو گرمی کیلئے پنکھے اور نہ سردی کیلئے انگیٹھی کا انتظام تھا۔ گرمیوں میں دوپہر کو طالبان اپنے چادر کو بھگو کر اپنے اُوپر ڈالتے اور پھر سوتے۔ اور سردیوں میں وہ اپنے بستروں میں بیٹھے رہتے۔ لیکن مدرسہ کے مہتمم کے کمرے میں دونوں چیزیں موجود تھے، پنکھا بھی اور انگیٹھی بھی۔ چھوٹے ہوں یا بڑے گاؤں کے زیادہ تر مدارس اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ حفظ کرنے والے طالبان تقریباً ایک ہی عمر کے تھے۔ جب عبد الولی سے قرآن شریف سُنا گیا تو استاد نے عبد الولی کو مشورہ دیا کہ تم پہلے قاعدہ ختم کر لو پھر قرآن شریف حفظ کر لینا۔ عبد الولی خوش ہوا کہ اب صحیح جگہ پہنچا ہوں مگر عبد الولی کی یہ خوشی اُس وقت ختم ہوئی جب اس کے کمرے کے ایک طالب نے عبد الولی سے کہا

(c) ketabton.com: The Digital Library

کہ آج شام میں اور تم نزدیک کے گاؤں وظیفہ اکٹھا کرنے کیلئے جائیں گے۔ عبدالولی پھر سے اپنے پُرانے کام پر لگ گیا، مگر اس دفعہ وہ ہفتہ میں صرف ایک دن وظیفے اکٹھی کرنے جاتا۔

اس مرتبہ عبدالولی چار مہینوں کے بعد گھر آیا۔ گل پانڑا نے بھی کچھ کچھ باتیں سیکھیں تھیں۔ عبدالولی اُس کے ساتھ اُس کی توتلی زبان میں باتیں کرتا، پہلے پہلے تو گل پانڑا کو عبدالولی اجنبی سا لگ رہا تھا، مگر ایک رات گزرنے کے بعد جُدا ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ عبدالولی جب صبح کی چائے پی رہا تھا تو پاس کے مسجد میں اعلان ہوا کہ فلاں شخص وفات پا چکا ہے لہذا سب قبرستان میں حاضر ہو جائیں۔ چائے کے بعد عبدالولی گھر سے باہر نکلا کہ قبرستان جائے۔ چچا اپنی گاڑی کے پاس گھر کے ساتھ کھڑا تھا۔ عبدالولی اُن کے پاس سلام ودعا کرنے کیلئے گیا۔

السلام علیکم چچا!

وعلیکم السلام۔ کب آئے ہو۔ تم نے پھر پگڑی باندھ لی؟ چچا نے بدنیتی کی انداز میں پوچھا۔

کل ہی آیا ہوں۔ عبدالولی نے جواب دیا۔ مگر چچا کی بات ناگوار گزری۔ اسی وقت سلیم اور اُس کا چھوٹا بھائی سکول کے یونیفارم پہنے گھر سے نکلے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ عبدالولی کو دیکھا مگر حال احوال نہیں پوچھا۔ سلیم نے اپنے بھائی کے کان میں کچھ کہا پھر دونوں عبدالولی کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ عبدالولی شرمندہ سا ہوا کہ یہ کیوں مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ اسی وقت ایک شخص آیا اور لعل محمد سے کہنے لگا۔

جانو چاچا وفات پا چکے ہیں، آپ کیا کر رہے ہو؟

میں کسی کو دیکھتا ہوں کہ بچوں کو سکول پہنچائیں اُس کے بعد قبرستان آؤنگا۔ عبدالولی قبرستان کی طرف روانہ ہوا، قبرستان میں مولوی صاحب نے قرآن کے پارے دیے کہ یہ لوگوں میں تقسیم کرو تاکہ لوگ پڑھیں۔ جس وقت عبدالولی کا چچا آیا تو عبدالولی اُس کے لیے سیپارہ لے گیا۔ جب عبدالولی نے سیپارہ آگے کیا تو چچا نے ذرا تُرش ہو کر پوچھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس کا کیا کروں؟

میرا خیال تھا کہ آپ پڑھیں گے۔ عبدالولی نے کہا۔

چھوٹے لڑکے ہو، تمھیں کس نے کہا کہ قبرستان آجاؤ۔ یہ پگڑی باندھی اسی لیے ہے کہ کوئی تمھیں کچھ دے سکے۔ باپ تو کچھ کہتا نہیں ہمیں شرمندہ کررہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ لعل محمد کا بھتیجا بھیک مانگنے آیا ہے۔ لعل محمد نے عبدالولی کو غصے سے کہا۔

اس میں بھیک مانگنے کی کیا بات ہے۔ ہم طالب یہ کام ہر جگہ کرتے ہیں۔ یہ تو آپ کا کام ہے ہم تو یہ پیسوں کیلئے نہیں کرتے۔ عبدالولی نے کہا۔

اپنی زبان بند کرو۔ جاؤ یہ ثواب کہیں اور کماؤ۔ اس گاؤں میں یہ کام تم نہیں کروگے۔ ثواب کے نام پر پیسے بٹورتے ہو۔ چچا نے اور غصے سے کہا۔

قریب بیٹھے ایک شخص نے کہا، لعل محمد کیوں غصہ کررہے ہو۔ یہ تو ثواب کا کام ہے۔

آپ چھوڑیں اس بات کو، کل کو یہ اس کی عادت بن جائے گی۔ لعل محمد نے کہا۔

عبدالولی کو اپنے چچا کی باتیں ناگوار گزریں۔ اُس نے سیپارے واپس رکھ دیے اور گھر کی طرف چل پڑا۔ جب گھر پہنچا تو بہت ہی ناراض تھا۔

کتنی جلدی دفنا دیا۔ ماں نے پوچھا۔

ابھی تک نہیں دفنایا۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

تو پھر کیوں آئے اور یہ تمھارا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟ ماں نے پوچھا۔

چچا نے مجھے ڈانٹا۔ کہہ رہا تھا تم کیوں قبرستان آئے ہو۔ عبدالولی نے کہا۔

کیا ہوا جو اُس نے ڈانٹا۔ بڑے ہیں بڑوں کی ڈانٹ کا بُرا نہیں مانتے۔ ماں نے کہا۔

دوسروں کے سامنے کہا کہ تم بھیک مانگنے آئے ہو۔ کیا میں بھیک مانگنے گیا تھا۔ ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میں اُس کا دشمن ہوں۔ عبدالولی نے غصے اور رونے کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں صدقے جاؤں کوئی بات نہیں وہ بڑے ہیں۔ تم بیٹھو میں تمھارے لیے قہوہ چائے بنا کر لاتی ہوں۔ماں نے پیار سے کہا۔

قہوہ چائے نے تو مدرسہ میں بھی پیٹ میں کھچڑی بنائی ہے میٹھی چائے بنا کر لاؤ۔ عبدالولی نے ماں سے پیار میں کہا۔

تھوڑی سی چینی پڑی ہے وہ میں نے تمھارے ابو کی چائے کیلیئے رکھی ہے، میں تمھارے لیے گڑ والی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ ماں نے کہا۔

جس چیز کی ہو لیکن میٹھی ہو۔ میں کونسا سلیم کی طرح مغرور ہوں۔ ماں ! آج اُس نے میرے ساتھ حال احوال بھی نہیں کیا، اُلٹا مجھ پر ہنس رہا تھا۔ عبدالولی نے ماں سے کہا۔

کسی کی باتوں پر دھیان نہ دو اپنے سبق پر توجہ دو، وہ جو بھی کرتے ہیں تم اُس کی پرواہ مت کرو۔ ماں نے سمجھایا۔

سہ پہر کو عبدالولی گھر سے نکلا تو چچیرے بھائی بھی سکول سے آئے تھے۔ عبدالولی دکانوں کے سامنے گیا اور وہاں دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ کچھ دیر بعد سلیم سائیکل چلاتا ہوا وہاں آیا اور اُن کے کھیل میں شریک ہوا۔ سائیکل کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا۔

میں تمھاری سائیکل چلالوں؟ ایک لڑکے نے سلیم سے کہا۔

جاؤ چلالو، سلیم نے لڑکے کو اجازت دے دی۔ لڑکا سائیکل لے کر چلانے لگا، پھر وہ لے کر آیا تو عبدالولی نے سلیم سے کہا۔

میں تمھاری سائیکل چلالوں؟

تمھیں سائیکل چلانا کب آتا تھا۔ سلیم نے کہا۔

سیکھ لونگا۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

جاؤ جاؤ اپنے پائنچے مت پھڑواؤ اُس سے۔ بعد میں کس چیز سے سیو گے؟ سلیم اُس پر ہنسا اور لڑکے بھی اُس کے ساتھ ہنسے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

یہ کیسی پگڑی ہے جیسے رسی۔ سلیم نے اُس کی پگڑی انگلی سے گراتے ہوئے کہا۔

ارے یار یہ تو گنجا ہے، اس نے کدو پر پگڑی باندھی ہے۔ سلیم نے ایک زوردار تھپڑ اُس کے گنجے سر پر مارا۔

مت کرو یار، کیوں مار رہے ہو، لگتی ہے۔ عبدالولی نے کہا۔

یہ پگڑی اپنی ماں کو دو تاکہ وہ کنویں سے پانی نکال سکے۔ ہر روز وہ ہمارے گھر سے لوٹا اور رسی لے جاتی ہے۔ سلیم نے کہا۔

تمھیں میری پگڑی سے کیا کام۔ تمھاری طرح تو نہیں ہوں جو بغیر کچھ سر پر پہنے پھر رہے ہو۔ عبدالولی نے کہا۔

کیوں بغیر کچھ سر پر پہنے گناہ ہے؟ سلیم نے پوچھا۔

بالکل گناہ ہے، میرے استاد کا کہنا ہے کہ یہ کافروں کا شیوا ہے۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

تمھارا کیسا استاد ہے، وہ کب استاد تھے، وہ تو مولوی ہیں۔ سلیم نے کہا۔

جو کسی کو سبق پڑھائے کیا وہ استاد نہیں؟ عبدالولی نے پوچھا۔

تم تو مسجد میں پڑھتے ہو کونسا سکول میں پڑھتے ہو۔ سلیم نے کہا۔

کیا میں ایک بار تمھاری سائیکل چلالوں؟ عبدالولی سائیکل کے نزدیک ہوا۔ چھوڑو، میری سائیکل سے دور ہو جاؤ۔ سلیم نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔

کھا تو نہیں رہا ہوں، صرف دیکھ رہا ہوں۔ عبدالولی نے کہا۔

نہیں، مت دیکھو، بھوکے کے بچے۔ سلیم نے کہا۔

دیکھونگا، بھوکا تمھارا باپ۔ عبدالولی نے سائیکل کو دھکا دیا سائیکل ایک طرف گر گئی۔ سلیم نے عبدالولی کو تھپڑ مارا، دونوں کی لڑائی شروع ہو گئی۔ لڑکوں نے دونو کو چھڑایا۔ سلیم کے

(c) ketabton.com: The Digital Library

چہرے پر عبدالولی کے ناخن کے نشان تھے۔ دونوں اپنے اپنے گھر گئے۔ تھوڑی دیر بعد سلیم کی ماں سلیم کو ہاتھ سے پکڑ کر عبدالولی کے گھر آ گئی۔

جب پال نہیں سکتی تو پیدا کس لیے کیے۔ اس بھوکے نے میرے بیٹے کا چہرہ زخمی کر دیا ہے۔ سلیم کی ماں نے غصے کے انداز میں عبدالولی کی ماں سے کہا۔

تم آؤ بیٹھ جاؤ، خدا سب خیر کرے گا۔ عبدالولی کی ماں نے کہا۔

میں بیٹھنے کیلئے نہیں آئی، ہمارے ٹکڑوں پر پلا بڑھا آج ہم پر بدمعاشی کر رہا ہے۔ اچھا تھا کہ غائب تھا، بھاڑ میں جائے منحوس۔ سلیم کی ماں نے اب بد دعا دینا شروع کیں۔

بہن! یہ تو اتنی بڑی بات نہیں، بچے آپس میں لڑیں گے تو کبھی آپس میں کھیلتے رہیں گے۔

بالکل بھی میرے بچوں کے قریب نہ آئے۔ تم اس کے پیلے دانت، میلے ہاتھوں کو تو دیکھو اور میرے بیٹے کے ساتھ کھیلنا دیکھو۔ سلیم کی ماں نے خال دارہ کی بات کاٹتے ہوے کہا۔

تم میری بات تو سنوں۔ خال دارہ نے کہا۔

باتیں چھوڑو، اگر میں نے سلیم کے ابا سے کہا تو نہ تم رہو گی اور نہ تمھارا یہ بھوکا رہے گا۔ سلیم کی ماں یہ کہتے ہوئے چلی گئی۔

خال دارہ کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو دکھائی دینے لگے۔ اُس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اُسے صاف کیا۔ عبدالولی نے جب ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اُس کے قریب ہوا۔

ماں! میں تو صرف اُس کی سائیکل دیکھ رہا تھا، اُس نے مجھے تھپڑ مارا۔ میں نے جان بوجھ کر اُس سے لڑائی نہیں کی۔

بیٹا! خدا کسی کو غریب نہ کرے۔ جب غریب ہوئے تو قصوروار ہوئے۔ تمام زندگی مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انہوں نے ہمیں ایک خشک روٹی کا ٹکڑا دیا ہو جو میرے بچے آج اِس کے ٹکڑوں پر پلے ہیں۔ خال دارہ نے یہ بات درد بھرے لہجے میں کہی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ماں! ہم نے اِن کا کیا بگاڑا ہے۔ عبدالولی نے معصومیت سے پوچھا۔

کچھ بھی نہیں بگاڑا۔ صرف اِن کے گھر کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ ماں نے کہا۔

دوسرے دن جب عبدالولی لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا تو ایک شخص نے کہا۔

ارے تمھیں تو اپنا درس پڑھنا چاہیے تھا، تمھیں کیا ضرورت تھی کہ کھیل کود میں پڑ گئے۔ تمھیں بھی انہوں نے پگڑی باندھی ہے، تمھیں تو مسجد میں ہونا چاہیے تھا۔ تمھیں یہ کھیل کود زیب نہیں دیتا۔

میں کیوں نہیں کھیل سکتا؟ جو پگڑی باندھ لیتا ہے طالب کہلاتا ہے تو کیا وہ نہیں کھیل سکتا۔ عبدالولی نے معصومیت کی انداز میں پوچھا۔

بکواس بند کرو، چھوٹے لڑکے ہو کر اتنی بدتمیزی۔ اس کی جگہ کہ وہ شخص عبدالولی کو جواب دیتا اُلٹا اُسے ڈانٹ دیا۔

چچا میں کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔

مُنہ بند کرو اپنا، مزید باتیں بھی کر رہے ہو۔ شخص اور غصہ ہوا۔

اسے اپنے ساتھ کھیل میں شریک مت کرو، خود بھی گنہگار اور دوسرے بھی۔ شخص نے دوسرے لڑکوں سے کہا۔

لڑکے بھی ایک طرف ہو گئے اور عبدالولی اکیلا رہ گیا۔

ولی! تم آئندہ ہمارے ساتھ نہیں کھیلو گے، تمھاری وجہ سے لوگ ہمیں بھی کھیلنے نہیں دیتے۔ ایک لڑکے نے عبدالولی سے کہا۔

اُس دن کے بعد عبدالولی کبھی بھی کسی کے ساتھ کھیل میں شریک نہ ہوا۔ اور نہ کسی نے اُسے کھیل میں شریک کیا۔ کہ طالب کھیل نہیں کھیلتے۔ دوسرے بچے کھیل سکتے ہیں مگر طالب نہیں کھیل سکتا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ایک دن استاد نے بھی پڑھائی کے دوران کہا تھا کہ کھیل ایک فالتو کام ہے۔ دوسرے دن جب عبدالولی دکانوں کے پاس گیا تو لڑکوں سے علیحدہ کھڑا ہو گیا۔ لڑکوں کے کھیل کھود کو دیکھ رہا تھا اگرچہ اُس کا دل بہت چاہ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر میں خود نہیں کھیل سکتا تو دوسروں کو بھی نہیں کھیلنے دونگا۔ لڑکے ایک مخصوص کھیل جو کہ بڈئی سے کھیلا جاتا، کھیل رہے تھے۔ جب وہ سب کھیل میں مگن تھے تو عبدالولی نے اچانک یہ تمام (بڈئی) کو لُوٹ لو کے چیخ سے اُٹھا کر بھاگ گیا۔ آس پاس بیٹھے لڑکوں نے بھی بڈئی لُوٹ لیے۔ جو لڑکے یہ کھیل، کھیل رہے تھے وہ عبدالولی کے پیچھے بھاگنے لگے۔ عبدالولی سوچ رہا تھا کہ اگر لڑکوں کو کھیل سے نہیں روک سکتا تو اُن کا کھیل تو خراب کر سکتا ہوں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۴)

ایک ہفتے کی چھٹی گزارنے کے بعد عبدالولی پھر مدرسہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ ماں سے رخصت ہورہا تھا تو ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ عبدالولی کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ چھوٹی بہن گل پانڑا نے اُسے انگلی سے پکڑے اُس کے ساتھ کھڑی تھی۔

میں۔۔۔ بھی۔۔۔ توما لے۔۔۔ تات۔۔۔ داؤنگی۔ گل پانڑا نے اپنے توتلی زبان میں کہا۔

ماں نے گل پانڑا کو اپنی گود میں لیا۔ طالب لالا واپس آئینگے، پھر تمھیں بھی ساتھ لے جائینگے۔ مگر وہ بضد تھی، عبدالولی نے اُسے پیار کیا، چُوما، گھر سے روانہ ہوا۔

گل پانڑا کو اُسی طرح روتے چھوڑ دیا۔

باہر عبدالولی کے چچا کی گاڑی کھڑی تھی۔ سلیم اور اُس کا بھائی سکول جانے کیلئے اُس میں بیٹھے تھے۔ عبدالولی کا مدرسہ اِسی راستے نزدیک پڑتا تھا۔ عبدالولی چچا کے قریب گیا اور اُن سے کہا۔

چچا! میں بھی آپ کے ساتھ چلا جاتا ہوں، راستے میں اُتر جاؤنگا۔

بہت بے شرم لڑکے ہو، پچھلے دن سلیم سے لڑائی کی آج اُس کی گاڑی میں بیٹھنے کیلئے کہہ رہے ہو۔ چچا نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ بھی نااُمید ہوا، کپڑوں کی گٹھڑی ہاتھ میں لیے بڑی سڑک کی طرف روانہ ہوا۔

نااُمید ہو کر سوچ رہا تھا کہ میری بھی عجیب قسمت ہے، ہر کسی کو مجھ سے نفرت ہے، اپنا ہی چچا مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ کوئی بھی مجھے کھیل میں اپنے ساتھ شریک نہیں کرتا، انہی سوچوں میں تھا کہ گاؤں کا ایک شخص اس کے قریب آیا جو اپنے بچے کو سکول لے جارہا تھا۔ طالب! تم پہلوان کے بیٹے ہو؟ شخص نے پوچھا۔

ہاں۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مدرسہ میں پڑھتے ہو؟ شخص نے پھر پوچھا۔

ہاں مدرسہ میں قرآن شریف حفظ کر رہا ہوں۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

شاباش! بہت اچھا کام کر رہے ہو۔ یہ لو دس روپے اپنے لیے چیزیں خرید لینا۔ شخص نے عبدالولی کو دس روپے دیتے ہوئے کہا۔

عبدالولی نے شخص سے دس روپے لے کر جیب میں رکھ لیے اور بس کے سٹاپ پر کھڑا ہو کر بس کا انتظار کرنے لگا۔ اُن کے گاؤں کی اپنی بس نہیں تھی، دوسرے گاؤں کی بس آتی اور وہ اِن بسوں میں جاتے۔ اِن بسوں میں عورتیں پچھلی سیٹوں پر بیٹھتی اور مرد اگلی سیٹوں پر بیٹھتے۔ چھت پر بھیڑ بکریاں کھڑی کی جاتی۔ جب کبھی بھیڑ بکریاں زیادہ ہو جاتیں تو بس کے اندر گلی میں کھڑی کی جاتیں۔ یہ پیشاب وغیرہ کرتیں تو زیادہ تر لوگوں کے کپڑے خراب کر دیتیں۔ مگر لوگ مجبور تھے، دوسرا کوئی چارا نہیں تھا۔ زیادہ تر بسوں کے شیشے ٹوٹ چکے ہوتے، مٹی اس طرح اندر اُڑتی جیسے کوئی خود ہاتھ سے اُڑا رہا ہو۔ لوگ جب گاؤں سے بازار یا بازار سے گاؤں پہنچتے تو اُن کی شکلیں گرد کی وجہ سے پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مٹی کے ڈھیر سے نکلے ہوں۔ بس جب گاؤں سے شہر کی طرف نکلتی تو ہر جگہ رُکتی، اسی وجہ سے پہنچنے میں بہت دیر لگتی۔ لوگوں کا پورا دن اسی میں ضائع ہوتا۔ جب بازار سے نکلتا تو یہ بس بوریوں اور سامانوں سے بھر جاتی۔ آٹا، چینی، گوشت وغیرہ یعنی تمام ضروری سامان سے بھرا ہوتا۔ تھیلے اس لیے زیادہ ہوتے کیونکہ گاؤں کے لوگ مہینے بھر کا سودا ایک ہی دن لاتے۔ یہ لوگ مہینے دو میں ایک دفعہ بازار جاتے وہ بھی کسی ضروری کام سے، ورنہ بہت ہی کم لوگ بازار جاتے۔ بس جہاں بھی رُکتی یہ سب ایک مرتبہ ضرور اُترتے۔ کنڈیکٹر جب ان کو دوبارہ بس میں بٹھاتا تو بیچارے کا بُرا حال ہوتا۔

کچھ دیر بعد بس پہنچ گئی، عبدالولی بس میں سوار ہوا، وہ بس کی گلی میں کھڑا ہو گیا۔ منشی کرایہ لینے آگیا۔ عبدالولی نے ایک مرتبہ جیب میں ہاتھ ڈالا کہ منشی کو کرایہ دے لیکن واپس خالی ہاتھ جیب سے نکالا۔ اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ یہ پیسے منشی کو دے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ایسے ویسے کیوں ہو رہے ہو، جلدی کرو کرایہ دو۔ منشی نے کہا۔

طالب سے کوئی کرایہ نہیں لیتا۔ کیا خبر کہ اِس کا پاس ہے بھی یا نہیں۔ دوسرے شخص نے منشی سے کہا۔

اگر اِتنا ہی دکھ ہو رہا ہے تو تم ہی اس کی جگہ پر کرایہ دے دو۔ منشی نے کہا۔

کیوں نہیں دونگا تمھاری قسمت میں ثواب نہیں لکھا، بتاؤ کتنا کرایہ ہے۔ شخص نے منشی کو کرایہ دیتے ہوئے کہا۔

چار روپے ہوتے ہیں دو روپے دو تا کہ ہم بھی ثواب کمائیں۔ منشی نے کہا۔

عبدالولی سمجھ نہیں رہا تھا کہ یہ ثواب صرف مجھ سے کیوں جُڑا ہے۔ جب کبھی وہ مدرسہ کیلئے گاؤں میں وظیفہ اکٹھا کرتا تو اُس وقت بھی کبھی کبھار لوگ اُسے روپیہ دو روپیہ ثواب کی نیت سے دیتے۔ یا پھر اپنے بچوں کے پُرانے کپڑے ثواب کی نیت سے دیتے۔ پھر جب کبھی مدرسہ میں زکوٰۃ یا خیرات کی نیت سے لوگ کچھ دیتے تو اِن میں وہ لوگ زیادہ تر حصہ لیتے جن کے بچے مدرسہ میں نہیں سکول میں پڑھتے تھے۔ جب کبھی گاؤں میں کوئی خیرات ہوتی تو سب سے پہلے حصہ مدرسہ بھیجا جاتا۔ گرچہ اِن تمام باتوں کا اس کے پاس کوئی حل طلب جواب نہ تھا مگر ثواب کے تصور نے اس کے دماغ پر یہ اثر کیا تھا کہ تمام خیرات و زکوٰۃ اُن کا حق ہے۔ صرف اس نے نہیں بلکہ مدرسہ میں ہر طالب یہی سوچ رکھتا جب کبھی خیرات کا سُنتے تو بغیر پوچھے پہنچ جاتے۔ استاد بھی انہیں نہیں روکتے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے بھی لوگوں کے ثواب کو مد نظر رکھا ہو۔ اور خیرات ہوتی بھی انہی پر۔ مدرسہ میں سوکھی روٹی لسی کے ساتھ کھاتے۔ کبھی کبھار دال یا آلو ہوتا۔ گوشت تو وہ صرف مہینے میں ایک بار اِن کی عیاشی ہوتی۔ دودھ پتی چائے یا پھر میٹھا قہوہ تو مدرسہ میں اِن کا خواب تھا۔ اسی لیے یہ چیزیں خیرات میں لینا اِن کا حق تھا۔

طالب جاؤ اُن عورتوں کے ساتھ سیٹ خالی ہے اُس میں بیٹھ جاؤ۔ اُس شخص نے کہا جس نے عبدالولی کا کرایہ دیا تھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

عبدالولی بھی جاکر عورتوں کے ساتھ سیٹ میں بیٹھ گیا۔ جس عورت کے ساتھ وہ بیٹھا تھا اُس کے پاس ایک ٹوکری تھی۔ اِس ٹوکری میں ایک مرغی تھی، ساتھ میں ایک عورت برقعہ پہنے بیٹھی تھیں جو وقفے وقفے سے کھڑکی سے سر باہر نکالتی۔ اس کو اُلٹی آرہی تھی۔ اُلٹی کی وجہ سے گلہ خشک ہو گیا تھا۔ جب وہ اُلٹی کرتی ساتھ بیٹھی عورت اپنا مُنہ بند کر لیتی۔ جس نے مرغی ساتھ لی تھی۔ اُسے بھی اُلٹیاں آنی شروع ہو گئی۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔ اگلی دفعہ جب عورت نے اُلٹی کی تو یہ مرغی والی عورت بھی اور نہ سنبھال سکی۔ اُس نے بھی بھرے مُنہ اُلٹی کی۔ ساتھ بیٹھے عبدالولی اور قریب قریب لوگوں کے کپڑے خراب کر دیے۔ ایک سواری نے کنڈیکٹر کو آواز دی۔

یہ تم لوگوں نے کیا ڈرامہ شروع کیا ہے۔ جب دیکھو ہر کسی کو بٹھاتے ہو۔ کس لیے بٹھاتے ہو اگر اُلٹی آرہی ہے۔ ہمارے کپڑے خراب کرا دیے۔

کیا کریں حاجی صاحب! جب ہم اِنھیں نہیں بٹھائیں گے تو یہ بیچاری کس چیز میں جائیں گی۔ کنڈیکٹر نے کہا۔

انھیں شہر میں کیا کام ہے؟ گھر بیٹھیں۔ شخص نے کہا۔

کیوں؟ صرف تمھاری ضرورت ہے ان کی نہیں؟ دوسرے شخص نے کہا۔

اگر ضرورت ہے تو مُنہ سی کر بیٹھ جائیں۔ ہمارے کپڑے تو خراب نہ کریں۔ پہلے شخص نے کہا۔

اس پچھلی سیٹ پر اگر میں تمھیں بٹھاؤں تو تم بھی اُلٹیاں کروگے۔ بس کی پچھلی سیٹیں اتنی اچھلتی ہیں۔ یہ تو اِن کی مہربانی ہے کہ انہوں اپنے آپ کو سنبھالا ہے۔ دوسرے شخص نے کہا۔

جس دوسری عورت نے اُلٹی کی تو اِن کے ہاتھوں سے ٹوکری گر گئی تو ٹوکری سے مرغی باہر نکلی اور بس میں دوڑنے لگی۔ کسی کے سر پر بیٹھ جاتی تو کسی کے کاندھے پر۔ بس میں افراتفری

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہو گئی۔ کنڈیکٹر نے بس کو روکا، مرغی کو پکڑا، واپس ٹوکری میں ڈالا۔ اُلٹی پر مٹی ڈالی۔ ایک شخص نے عورت کو مخاطب کر کے کہا۔

اس مرغی کا کیا کرو گی جو لے جارہی ہو۔

بیٹی کے ہاں لے جارہی ہوں۔ کل اُس کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ اُس کیلئے ذبح کرونگی۔ عورت نے کہا۔

ہو، ہو۔ ایک تو یہ بیٹیاں نہ تو اُن کا پیٹ بھرے گا، نہ تم لوگوں کے ارمان پورے ہونگے۔ شخص نے افسوس کے انداز میں سر ہلایا۔

کنڈیکٹر نے پھر آواز دی۔ چلو استاد۔ بس روانہ ہوئی۔

عبدالولی اپنے مدرسہ پہنچ گیا، وہ اپنے درس میں مشغول ہو گیا۔ کچھ مہینوں کے بعد مدرسہ کے مہتمم اور اساتذہ نے اِن سے امتحان لیا۔ امتحان کے اختتام پر مہتمم نے تمام طالبان کو اکٹھا کر کے کہا۔

عزیز طالبان! جب کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ اب ہمارے مدرسہ کے درس کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے۔ اب مہینے دو چُھٹی ہو گی۔ چھٹیوں کے بعد مدرسہ دوبارہ کھل جائے گا۔ جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ مدرسہ اپنا ذریعہ آمدن نہیں رکھتا۔ مدرسہ میں کم و بیش سو کے قریب طالبان پڑھتے ہیں۔ اِن سب کا خرچہ بذریعہ چندہ پورا کیا جاتا ہے۔ میں آپ لوگوں کے سامنے ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں۔ یہ خدمت میں نے اپنے کندھوں پر رکھی تو نہ میری زمین ہے نہ ہی کوئی دوسرا کاروبار۔ تمام زندگی دین کی خدمت کیلئے وقف کی ہے۔ اور یہ کام اللہ کی رضا کیلئے اور روز آخرت میں ثواب کی نیت سے کر رہا ہوں۔

آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ اس خدمت میں میرے ساتھ تعاون کیجئے۔ میں نے چندے کی کاپیاں چھپوادی ہیں، وہ میں آپ لوگوں کے حوالے کر دونگا۔ چندے کیلئے وہ طالبان جائیں گے جو پچھلی مرتبہ گھر گئے تھے، اور وہ طالبان جو نئے ہیں اور پچھلے پانچ چھ مہینوں کے دوران

(c) ketabton.com: The Digital Library

آئیں ہیں۔ پچھلی مرتبہ جو طالبان چندے کیلئے گئے تھے وہ اس مرتبہ گھروں کو جائیں گے۔ اور رمضان مبارک کے فوراً بعد واپس مدرسہ آئیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ لوگ اس کام میں پوری ایمانداری کے ساتھ میری مدد کروگے۔

مہتمم کی باتوں کے بعد جو طالبان چندے کیلئے جانے والے تھے رہ گئے، اور باقی طالبان اپنے گھروں کو چل دیے۔ عبدالولی اور اُس کے ایک اور دوست کو چندے کی کاپیاں دے دیں گئ۔ عبدالولی کا ساتھی اللہ داد تھا جو عبدالولی سے سات یا آٹھ سال بڑا تھا۔ دونوں طالبان مدرسے کے چندے کیلئے روانہ ہوگئے۔ آج ایک گاؤں کل دوسرا گاؤں، اِس مسجد میں رات گزاری تو کبھی اُس مسجد میں رات گزاری۔ نماز کے بعد چادر بچھا کر چندہ کاپی اُس پر کشکول کی طرح سامنے رکھتے۔ کبھی کوئی کچھ پیسے دے دیتا تو کبھی صرف قہر زدہ آنکھوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک دن عبدالولی اپنے ساتھی کے ساتھ بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے اُنہیں متوجہ کیا۔

طالبان! السلام علیکم۔

وعلیکم السلام۔ دونوں نے بہ یک وقت جواب دیا۔

کس مدرسہ سے آئے ہو؟ شخص نے پوچھا۔

آج کل تو مدرسے بھی اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ قدم قدم پر مدرسہ موجود ہے۔ ایک دوسرے شخص نے طالبان کی جگہ جواب دیا۔

اللہ اِن کی تعداد اور بڑھائے۔ یہ تو دین کی خدمت ہے۔ پہلے شخص نے کہا۔

یہ کوئی خدمت ہے۔ سب بچوں سے بھیک منگوارہے ہیں، جس مسجد میں جاؤ انہوں نے چادر بچھائی اور اوپر چندہ کاپی رکھی بیٹھے ہونگے۔ اتنا سبق نہیں پڑھاتے جتنا اِن سے چندہ جمع کروایا جاتا ہے۔ دوسرے شخص نے بات پوری کی۔

پہلا شخص اِس کے بجائے کہ دوسرے شخص کو جواب دیتا وہ طالبان سے مخاطب ہوا۔

چلو میرے ساتھ آج رات میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

عبدالولی اور اُس کے ساتھی نے چادر سمیٹی اور شخص کے ساتھ روانہ ہوئے۔ شخص انہیں اپنے مہمان خانے میں لے آیا اور اُن کو وہیں بٹھایا۔

تم دونوں یہیں بیٹھو، میرا بیٹا تم لوگوں کیلئے کھانا لے آئے گا۔ کھانا کھانے کے بعد یہیں سو جانا، صبح نماز کیلئے پھر مسجد چلے جانا۔ شخص یہ بات کہہ کر گھر چلا گیا۔

کتنا اچھا آدمی ہے۔ عبدالولی نے اپنے دوست سے کہا۔

ہاں بھائی! دنیا میں آج بھی اچھے لوگ موجود ہیں۔ دوست نے کہا۔

کتنے خوش نصیب ہیں، گھر میں سب کچھ موجود ہے، دیکھتے ہیں کھانا کتنا اچھا ہوگا؟۔ عبدالولی نے لاشعوری طور پر اپنی محرومی کا اظہار کیا۔

یہ سب قسمت کی باتیں ہیں۔ دوست نے کہا۔

اِسی اثنا ایک خوبصورت لڑکا ہاتھ میں چلمچی اور پانی کا لوٹا لیے آیا۔ جسے ایک طرف رکھ کر، دونوں سے مصافحہ کیا، پھر دونوں کے ہاتھ دھلوائے۔ دوسرا چھوٹا بچہ دسترخوان اُٹھائے آیا، اِس لڑکے نے دونوں کے ساتھ کھانا کھایا، کھانا کھانے کے بعد لڑکے نے دونوں کے سونے کا بندوبست کیا۔ اور خود گھر چلا گیا۔

میں نے کہا تھا نا! کھانا دیکھا، کتنا زیادہ گوشت تھا، چاول کتنے مزیدار تھے۔ عبدالولی نے اپنے دوست سے کہا۔

قسم سے سچ کہا تم نے، ہمارے پیٹ میں تو اب دال اور آلو کی فصل اُگ چکی ہے۔ دوست نے کہا۔

وہ تو صرف نام کے دال اور آلو ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے دریا کے پانی میں نوالہ تر کیا جاتا ہے۔ عبدالولی نے کہا۔

تم فکر مت کرو، اللہ ہمیں بھی پیسے دے دیگا، پھر ہم بھی اِسی طرح گوشت کھایا کریں گے۔ دوست نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

یہ کتنا اچھا لڑکا تھا، ہمارے ساتھ کتنے اچھے انداز میں پیش آیا، اور ایک میرا چچازاد بھائی ہے جو اپنے سکول اور باپ کی پیسوں پر مغرور ہے۔ کسی کا لحاظ بھی نہیں کرتا۔ عبدالولی نے کہا۔

سو جاؤ، صبح جلدی اُٹھنا ہے۔ دوست نے کہا۔

دونوں اپنے اپنے بستر پر سو گئے۔

صبح سویرے گھر والوں نے انہیں جگایا، اُن کے ساتھ یہ دونوں بھی مسجد چلے آئے، نماز پڑھی، پھر نماز کے بعد مسجد کے طالبان کے ساتھ قہوہ چائے اور سوکھی روٹی کا ناشتہ کیا۔ چاشت کے وقت دوسرے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے، جب دوسرے گاؤں پہنچ گئے تو چندے کے پیسوں سے ایک صابن خریدا۔ گاؤں کے مسجد میں گئے، کپڑے اُتارے، اپنی چادروں سے دھوتی (لنگ) باندھے۔ کپڑے دھوئے اور تار پر سوکھانے کیلیئے ڈال دیے۔ دو لڑکے جن کے گھر مسجد کے قریب تھے مسجد کے سامنے بنٹے (گولیاں) کھیل رہے تھے۔ جیسے ہی اُن کا دھیان طالبان کے کپڑوں کی طرف ہوا تو دونوں نے ایک دوسرے کے کان میں کچھ کہا اور پھر اُٹھ کر وہاں آ گئے جہاں اِن دونوں کے کپڑے سوکھنے کیلیئے تار پر لٹک رہے تھے۔

عبدالولی کی قمیص اور اللہ داد کی شلوار چُرا کر بھاگ گئے۔ یہ دونوں اُن کے پیچھے بھاگنے لگنے، وہ دونوں گھر میں گھس گئے، یہ دونوں دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے، کہ اتنے میں ایک شخص باہر نکلا۔

کون ہو جو گلی میں ننگے کھڑے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ شرم نہیں آتی؟ شخص نے غصے میں کہا۔

ہم نے مسجد میں کپڑے دھو کر تار پر لٹکائے تھے کہ دو لڑکے اُنہیں چُرا کر اِس گھر میں گھس گئے۔ اللہ داد نے کہا۔

دفع ہو جاؤ بے غیرتوں۔ پرائے لڑکے ہو اور ننگے گلیوں میں گھوم رہے ہو۔ بے حیائی کر رہے ہو یہاں۔ شخص نے پھر وہی انداز اپنایا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

چاچا! ہمارے پاس اور کپڑے نہیں ہیں۔ وہی ایک جوڑا ہے۔ ہم کہاں جائیں؟ عبد الولی نے اپنی مجبوری بیان کی۔

چاچا! شخص نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔ میں تمھیں چاچا نظر آرہاہوں۔ تم دونوں ہو کون؟ کہاں کے ہو؟ اور اس گاؤں میں کیا کر رہے ہو؟

ہم مدرسہ میں پڑھنے والے طالب ہیں، اور چندہ جمع کرنے کیلئے آئے ہیں۔ اللہ داد نے کہا۔

چندہ کیلئے آئیں ہیں۔ شخص نے اللہ داد سے اُسی انداز میں کہا۔

کیوں یہ نہیں کہتے کہ چور ہو۔ چندے کے نام پر گاؤں میں چوریاں کرتے ہو۔ لوگوں کے گھروں میں گھستے ہو۔ جاؤ یہاں سے، دوبارہ یہاں تمھیں نہ دیکھوں۔

اسی اثنا ایک بچہ ان کے کپڑے لے آیا،

میری ماں کہتی ہے یہ کپڑے تم لوگوں کے ہیں؟ بچہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ہاں ہمارے ہیں۔ عبد الولی نے جھپٹ کر بچے سے کپڑے لے لیے۔

یہ دونوں جب بھی کسی گاؤں جاتے تو کھیل کھود میں لگ جاتے۔ یا پھر کھیل کا تماشہ کرتے۔ گاؤں کے لڑکے بھی انہیں تنگ کرتے۔ کبھی کوئی اِن سے اِن کی پگڑی چھین لیتا، دوسرا ان کے سر پر مٹی ڈال دیتا۔ تو یہ دونوں منت سماجت کرتے یا پھر کبھی کبھار نوبت جنجال تک پہنچ جاتی۔ کسی بھی گاؤں میں جاتے اُس گاؤں کے لڑکوں کو یوں لگتا جیسے دوسرے علاقے کے کُتے علاقائی کُتوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۵)

مدرسہ کھلنے سے پہلے دونوں مدرسہ پہنچ گئے۔ مہتمم گرچہ خوش نہیں تھا مگر دونوں نے اتناچندہ اکھٹا کیا تھا کہ ناراض بھی نہیں تھا۔

عبدالولی سے کہا کہ تم ایک مرتبہ گھر جاؤ، پڑھائی کیلئے کچھ دن ہیں، پھر واپس آجانا۔ عبدالولی بہت خوش ہوا۔

جب گھر پہنچا تو ماں پہلے سے زیادہ بیمار تھی۔ گل پانڑا اب اچھی طرح بول سکتی تھی۔ بھائی سارا دن گریبان چاق جوتوں کے بغیر گلیوں میں کھیل کود میں مصروف تھے۔ احمد خان جو کہ عبدالولی سے گیارہ مہینے چھوٹا تھا کبھی کبھی اپنے والد کے ساتھ مزدوری پر جاتا۔ عبدالولی ماں کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ سارا دن ماں کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ گھر کا کام کاج بھی کرتا، کپڑے بہت اچھی طرح دھوتا تھا۔ کیونکہ وہ مدرسہ میں اپنے کپڑے خود دھوتا تھا۔ جب کبھی چچیرہ بھائی سلیم اِسے دیکھتا تو بغیر مذاق کے اُسے کوئی اور کام نہ تھا۔ لڑکوں کے سامنے اُس کا مذاق اڑاتا، گلی محلے کے دوسرے لڑکے بھی اُس نے ساتھ ملا لیے تھے۔ عبدالولی اُسے اِس لیے کچھ نہیں کہتا کہ پھر اُس کے والدین ہمارے ساتھ جھگڑیں گے۔

ایک دن عبدالولی عصر کی نماز کے بعد گھر آیا، ابا بھی اُسی وقت مزدوری سے آئے تھے، بہن اُس کیلئے قہوہ چائے لے آئی، وہ ماں کے ساتھ بیٹھ گیا، اچانک ماں کی سانسیں اکھڑنے لگیں، آنکھیں ایک ہی جگہ پر ٹھہر گئیں،

بابا۔۔۔بابا۔۔۔ماں کو کیا ہوا۔ عبدالولی نے جلدی سے والد کو مخاطب کیا۔

والد نے بھی جلدی سے چائے کا پیالہ رکھا اور بھاگ آیا۔

کیا ہوا؟

پتہ نہیں، میں جب آیا تو بالکل ٹھیک تھیں۔ اب کیا ہو گیا۔ عبدالولی نے روتے ہوئے جواب دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

وہاں لعل محمد کے پاس جاؤ، اور اُس سے کہو کہ آئے اور اِسے اپنی گاڑی میں ڈاکٹر تک لے جائے۔ والد نے کہا۔

عبدالولی بھاگتا ہوا اپنے گھر سے چچا کے گھر گیا۔ گیٹ کے ساتھ ہی سلیم اپنے بھائی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ جیسے ہی عبدالولی کو دیکھا تو اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

کیا کر رہے ہو جو بھاگتے ہوئے آرہے ہو، ایسا لگ رہا ہے جیسے کُتا پیچھے پڑا ہو۔

میری ماں کو پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔ اچھے چاچُو کدھر ہیں؟ عبدالولی کی سانسیں تیز چل رہی تھیں۔

کیوں اچھے چاچُو ڈاکٹر ہیں۔ سلیم اُس پر ہنسا۔

بابا کہہ رہے تھے کہ گاڑی میں ڈاکٹر تک لے جائیں گے۔ عبدالولی نے کہا۔

جاؤ جاؤ، وہ تمھاری ماں کا نوکر نہیں۔ سلیم نے عبدالولی کو دھکا دے کر کہا۔

خدا کیلئے، میری ماں مر جائے گی۔ ایسا مت کرو۔ عبدالولی نے منت سماجت کی۔

تو کیا ہوا جو مر گئی۔ اچھا ہے کہ مر جائے۔ سلیم نے اُسے پھر دھکا دیا۔

اسی اثنا پہلوان بھی پہنچ گیا۔

تم ابھی تک یہی کھڑے ہو؟

یہ مجھے جانے نہیں دے رہا۔ عبدالولی نے والد سے کہا۔

پہلوان نے عبدالولی کی بات نہیں سُنی اور بھائی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں بھائی اور بھابھی بیٹھے چائے پی رہے تھے، عبدالولی بھی کوشش کر رہا تھا کہ والد کے پیچھے جائے، مگر سلیم نے اُس کی پگڑی گرادی۔ وہ بغیر پگڑی کے والد کے پیچھے چلا گیا۔ جب وہاں والد اور چچا کی باتیں سنیں تو واپس اپنی پگڑی کیلئے آگیا۔ جاتے جاتے سلیم کی گردن پر ایک مکہ دے مارا اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔ جب گھر پہنچا تو والدہ کچھ ہوش میں آچکی تھیں، عبدالولی خوش ہوا۔ اُس نے ماں سے ابھی کچھ پوچھا بھی نہیں تھا کہ صحن میں والد اور چچا کی آواز سنائی دی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں تمھارے سامنے اُسے پھانسی دے دونگا۔ تم اتنا غصہ مت کرو۔ پہلوان اپنے چھوٹے بھائی لعل محمد سے کہہ رہا تھا۔

نہیں لالا !نہ آپ کو شرم آتی ہے اور نہ ہی آپ کے لڑکے کو۔ یہ کون ہوتا ہے جو میرے بیٹے کو پیٹے۔ ایک دن نہیں دو نہیں، آیا نہیں ہوتا کہ میرے بیٹے کو پیٹنے لگتا ہے۔ پچھلی بار بھی میں نے اُس سے کہا تھا کہ میرے بچوں سے دُور رہو، مگر اُسے کوئی شرم نہیں۔ آج فیصلہ ہو کر رہے گا، اب یا میں اِس گاؤں میں رہونگا یا آپ کا بیٹا۔ لعل محمد اتنے غصے میں تھا جیسے اُس کے بیٹے کو کسی نے قتل کیا ہو۔

کہاں ہے یہ ولی کا بچہ ؟ پہلوان کمرے کی طرف گیا۔

ماں جس کی ابھی ابھی تھوڑی طبیعت ٹھیک ہوئی تھی پوچھنے لگی کہ

کیا ہوا؟ پھر کیا طوفان آیا ہے۔

پہلوان بغیر پوچھے عبد الولی کو پیٹنے لگا، کبھی لات تو کبھی گھونسہ۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔ میں نے تمھیں کس لیے بھیجا تھا اور تم کیا کر آئے ہو۔

میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔۔اس۔۔۔۔اس۔۔کا۔۔۔۔۔۔۔

زبان چلاتے ہو، چُپ ہو جاؤ۔ والد نے گردن پر ایک تھپڑ مارا۔

بھائی لعل محمد! صبح یہ چلا جائے گا، میں کہہ رہا ہوں آپ جاؤ۔ پہلوان نے اُسی غصے میں اپنے بھائی سے کہا۔

میں دیکھتا ہوں یہ کیسے نہیں جاتا۔ اگر یہ نہیں گیا تو مجھے دوسرا طریقہ آتا ہے۔ لعل محمد نے بھائی کو دھمکی دی اور چلا گیا۔

جب بھی آتے ہو کوئی نہ کوئی پریشانی ساتھ لاتے ہو۔ میرے گھر سے نکل جاؤ، میں تمھاری خاطر اپنے بھائی سے نہیں لڑ سکتا۔ تمھیں جانا ہو گا۔ جانا ہو گا۔ پہلوان نے عبد الولی کو دھکا دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

تمھیں ہو کیا گیا ہے جو بچے کو دھکے دے رہے ہو۔ تمھارے بھائی کو میرے بچے کبھی بھی پسند نہیں تھے۔خال دارہ نے اپنے خاوند سے کہا۔

ہاں، ہاں۔ تم بھی اِس کی طرف دار بن جاؤ۔ تا کہ یہ ٹھیک ہو جائے۔پہلوان نے اپنی بیوی سے کہا۔

عبدالولی نے بھی اپنے کپڑے اکٹھے کیے اور ماں کے قریب ہوا۔

ماں میں جارہاہوں۔عبدالولی نے مایوسی اور رونے کے انداز میں کہا۔

کہاں جاؤگے اِس وقت؟ماں نے پوچھا۔

مدرسے جاؤنگا۔عبدالولی نے جواب دیا۔

اِس وقت تم مدرسے جاسکتے ہو؟ یہ وقت جانے کا نہیں۔ صبح چلے جانا۔ماں نے کہا۔

صبح سویرے عبدالولی اپنی گھٹڑی اُٹھائی۔ماں کا ہاتھ چُوما۔ گل پانڑا کو آنسووں سمیت پیار کیا۔اور روانہ ہو گیا۔بڑی نااُمیدی کے ساتھ دروازے سے باہر گیا۔جب گاؤں کے ٹیلے پر پہنچا تو آنکھوں میں آنسوں لیے ایک نظر گاؤں کی طرف دیکھا۔اُس نے اپنے آپ سے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک میں بڑا آدمی نہیں بن جاتا گاؤں نہیں آؤنگا۔ اچھی طرح سبق پڑھونگا،عالم بنوں گا، پھر آونگا۔ پھر اپنی گھٹڑی کو دیکھا جس میں وہ اپنے پُرانے کپڑوں کے ساتھ ساتھ اِس گاؤں کی نفرت بھی ساتھ لیے جارہاتھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۶)

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اپنی گردش بر قرار رکھتا ہے۔ اِسی طرح وقت نے عبدالولی کی زندگی کا رُخ بھی بدل دیا۔ عبدالولی زندگی کے اُس موڑ پر تھا جس میں کانٹے بھی پھول لگنے لگتے ہیں۔ مگر وہ صرف پھولوں ہی کی خواہش کر سکتا تھا۔ اُس کی زندگی تو پھولوں سے کانٹوں میں تبدیل ہوگئی تھی۔ اِس مدرسہ میں نصف قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد وہ دوسرے مدرسے چلا گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر والوں کو پتہ چلے کہ وہ کس مدرسے میں ہے۔ اُس نے بہت سے مدارس کے چکر کاٹے اور ساتھ ہی ساتھ ہر مدرسے کے چندے کیلئے بہت سی جگہوں پر چادر بھی بچھائی۔ اب اُس نے قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ عبدالولی کے سینے میں قرآن شریف کے ساتھ ساتھ تین چہرے ایسے بھی تھے جو کہ پیار و محبت کا چادر اوڑھے محفوظ تھے۔ اور باقی تمام چہرے نفرت زدہ تھے۔ ماں، بہن اور زرقا کو اُس نے اپنے حافظے میں مقامِ محبت کا درجہ دیا تھا۔ عبدالولی نے بچپن ہی سے زرقا کو اپنے تصور میں ایک محبوبہ کا مقام دیا تھا۔ زرقا کی ایک خیالی تصویر اپنے ذہن میں بنا رکھی تھی۔ اور جب بھی وہ اپنے بستر میں سونے لگتا تو زرقا کی خیالی تصویر اُس کے خیال کا کینوس پر اُس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ کبھی وہ اُس کے پاس ہوتی۔ کبھی وہ اُس کی باہوں میں باہیں ڈالے ہوتا تو کبھی اُسے سینے سے لگالیتا۔ زرقا کی بچپن کی محبت اُس کی جوانی کے ایام میں اُس کے وقت گزارنے کا ایک ذریعہ بن گئی تھی۔ جو پیار زرقا نے عبدالولی کو بچپن میں دیا تھا پھر دنیا میں اُس کیلئے پیار کا حصہ تمام ہوا تھا۔ پھر نہ کوئی اُس کیلئے چھُپ کر چیزیں لایا اور نہ پھر اُس نے اپنے لیے پیار بھری آواز سُنی۔ اُس کے کان پیار کے الفاظ سے ناآشنا ہوئے تھے۔ اِس گزری ہوئی زندگی میں یا تو اُس نے ہمدردی کے الفاظ سنے تھے یا پھر نفرت کے۔ اُس کے شعور کے پردے پر صرف نفرت کے عکس نظر آرہے تھے۔ ماں، بہن اور زرقا کے عکس بھی نفرت زدہ نظر آنے لگتے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

نفرت اِس طرح اُس کے گرد لپٹی تھی جیسے تصویر پر فریم۔ بچپن سے وہ اِس نفرت کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اِس لڑائی نے عبدالولی میں ایک اور عبدالولی کو جنم دیا تھا۔ ایسا عبدالولی جو پیار بھی نفرت ہی کے ذریعے کرتا تھا۔

عبدالولی ایک خوبصورت نوجوان بن چکا تھا۔ بڑی آنکھیں، باریک مونچھیں اور ناک بھی تھوڑی موٹی ہو گئی تھی۔ گھنی بھنویں، لمبا قد، روئی کی طرح داڑھی۔ عبدالولی بچپن ہی سے سُرخی مائل تھا۔ آنکھیں اُس کی ہر وقت میلی رہتیں۔ سر کے بال منڈھے ہوئے۔ مہینے میں ایک بار ضرور وہ سر منڈھواتا۔ پاؤں لمبے ہونے کے بجائے چوڑے تھے۔ اِس لیے کہ بغیر جوتوں کے زیادہ پھرتا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں اکثر سردیوں میں خشکی کی وجہ سے پھٹے ہوتے۔ قد و قامت میں بالکل اپنے باپ پر گیا تھا۔

مگر اب، جوانی میں ایک مضبوط قد و قامت کا مالک بن گیا تھا۔ منڈھے (گنجے) سر کی بجائے اب اُس نے بڑے بال رکھے تھے۔ آنکھوں میں اب میل کی بجائے سُرما تھا۔ اب عبدالولی خوابوں کا شہزادہ بن گیا تھا۔ مدرسے کی خشک روٹی اور لسی نے عبدالولی کا جسم لوہے کی طرح مضبوط بنا دیا تھا۔ مگر یہ شہزادہ غربت اور طعنوں کی وجہ سے اندر ہی اندر ٹوٹ چکا تھا۔ جس دن سے وہ گاؤں سے اپنے ساتھ نفرت کی گھٹڑی لایا تھا یہی نفرت کی گھٹڑی وہ اپنی پیٹھ پر لیے پھر رہا تھا۔ اُس نے پھر گاؤں کی زمین پر پاؤں نہیں رکھا۔ اُس کی کوشش یہی تھی کہ جتنا ہو سکے گاؤں سے دُور رہے۔ اسی لیے تو اُس نے بہت سے مدارس کے چکر کاٹے۔

قرآن شریف کو حفظ کرنے کے بعد عبدالولی نے دینی کتابوں کا درس شروع کیا تھا۔ اپنے دوست اللہ داد کو اُن تمام باتوں سے آگاہ کیا تھا جو اُس نے برسوں سے اپنے دل میں چُھپائے رکھی تھیں۔

اللہ داد، اگرچہ اُس سے عمر میں بڑا تھا مگر ہم عمر دکھائی دیتا تھا۔ حالات کے تھپیڑوں نے اُس کے چہرے کی رونق چھین لی تھی۔ کبھی کبھار شاعری بھی کر لیتا۔ بہت ہی اچھا انسان تھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

عبد الولی کو اللہ داد پسند تھا، اسی لیے تو اُس نے اللہ داد کے ساتھ دوستی کا رشتہ مضبوط کیا تھا۔ جس مدرسے میں جاتے تو اکٹھے جاتے۔ اللہ داد قندہار کے کشکی نخود کا رہنے والا تھا جو کہ میوند کا قریبی علاقہ ہے۔ عمر کے فرق کے باوجود عبد الولی اور اللہ داد ایک ہی کتاب (ہدایہ) پڑھتے تھے۔ اللہ داد کو اپنے خاندان سے افغانستان کی جنگ کی وجہ سے ہاتھ دھونا پڑے۔ جبکہ عبد الولی کو نفرت کی وجہ سے اپنے خاندان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ خاندان مٹی میں مل گیا اور عبد الولی کی نفرت زندہ تھی۔

اللہ داد کا رنگ گندمی، جسامت میں دُبلا پتلا، جیسے کسی لکڑی کو کپڑے پہنائے جائیں اور داڑھی ٹوڑھی پر زیادہ باقی چہرے پر کم تھی۔ ہلکی مونچھیں جو کہ داڑھی کے ساتھ مل رہی تھیں۔ ہر وقت اُس کے کندھے پر ایک چادر رکھی ہوتی۔ سامنے کے دو دانت تھوڑے بڑے تھے۔ کان بھی سر پر تھوڑے بڑے لگتے تھے۔ اگر چہرہ تھوڑا بھرا ہوتا تو شاید کہ کان بُرے نہ لگتے۔

اِن دنوں افغانستان میں تحریک طالبان نے سر اُٹھایا تھا۔ افغانستان کے عوام مجاہدین کے داخلی جھگڑوں سے تنگ آ چکے تھے۔ مجاہدین کمانڈروں نے اپنے اپنے علاقے تقسیم کیے تھے۔ ایک مرکزی حکومت نہیں تھی۔ افغانستان میں مدد کرنے والے ممالک خاص طور پر مغربی ممالک اور امریکہ اپنے مفادات حاصل کرنے کے بعد افغان عوام اور افغانستان کو اُسی طرح بے یارو مدد گار اور مجاہدین کو آپس میں لڑتا چھوڑ گئے تھے۔

جس کی جتنی طاقت ہوتی اُتنے ہی علاقے پر اپنا کنٹرول رکھتا۔ قدم قدم پر ہر کسی کی اپنی حکومت تھی۔ افغانستان کی عوام ایسے حالات میں گر چکے تھے کہ نہ تو اُن کا گھر محفوظ تھا اور نہ ہی عزت۔ نسلِ نو کو اندھیروں کا سامنا تھا۔ ایسے حالات میں تحریک طالبان قندہار کے سپین بولدک سے مُلا عمر کی امارت میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ عرصہ اسی علاقے تک محدود رہے، پھر آگے بڑھنے لگے جیسے فرشتے ان کے ساتھ ہم رکاب ہوں۔ نام نہاد کمانڈروں کی حکومتوں کو گراتے اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

علاقوں میں امن و امان لاتے۔ چور اُچکے سب ختم ہو گئے۔ اِن کا قانون بہت ہی سخت تھا جس پر عمل درآمد کرنا اور کرانے پر ان کی پوری کوشش رہتی۔

تحریک طالبان کے نقارے چمن، پشین، ژوب، لورالائی حتٰی کہ پورے پشتون وطن میں بج رہے تھے۔ تمام مدارس کے اساتذہ اور طالبان پورے جوش و جذبے سے تحریک طالبان کی حمایت کرنے کیلئے کمر کسنے لگے۔ مولوی صاحبان نے افرادی قوت بڑھانے کیلئے مدارس اور مسجدوں کو استعمال کیا۔

عبدالولی جس مدرسہ میں پڑھتا تھا وہاں بھی تحریک طالبان کے اثرات پہنچ چکے تھے۔ درس و تدریس کی بجائے مدرسہ میں تحریک کو آگے بڑھانے کیلئے عملی کام شروع ہو چکا تھا۔ مدرسہ میں ایسے طالبان بھی دیکھے جاتے جنہیں پشتو زبان بولنی نہیں آتی تھی۔ اور درس و تدریس سے بھی اُن کی خاص دلچسپی نہ تھی۔ زیادہ تر وقت وہ مدرسہ کے مہتمم کے کمرے میں مہتمم کے ساتھ گزارتے۔ اکثر صبح جاتے اور شام کو آتے۔ طالبان کے اِس تحریک نے عوام میں ایک اُمید کی کِرن پیدا کی تھی۔ اسلامی نظام زندگی کی اُمید، انصاف اور بھائی چارے کی اُمید، اِس لیے عوام کی جانب سے اِس تحریک کو خوش آمدید کہا گیا۔ عبدالولی کے دل میں بھی اُمید کی کِرن دکھائی دینے لگی۔ نا اُمید دل پر کاروانِ اُمید دستک دینے لگا۔ مہتمم مدرسہ کی جوشیلے تقاریر نے درس کی بجائے عملی میدان میں کودنے کے اِرادے مضبوط کیے۔

اللہ داد اخوند! کیا کہتے ہو طالبان کے ساتھ جہاد پر جائیں؟

عبدالولی اخوند! مجھے تو اِس نام سے بھی نفرت ہونے لگی ہے۔ اِس نام پر ہماری عوام نے اتنے دھوکے کھائیں ہیں کہ حساب نہیں۔ اللہ داد نے کہا۔

پُرانی باتوں کو چھوڑو، اب تو طالبان یہ کام کر رہے ہیں۔ میرے اور تمھارے جیسے طالبان۔ عبدالولی نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

جہاد بھی میری اور تمھاری طرح کے لوگ کر رہے تھے جو بعد میں فساد میں تبدیل ہوا۔ اللہ داد نے جواب دیا۔

اب ایسا نہیں ہو گا، میرا یقین ہے کامیابی ہمارا مقدر بنے گی۔ پچھلے دن مولوی صاحب نے اس کی کتنی فضیلت بیان کی۔ عبدالولی نے کہا۔

عبدالولی ایک کہاوت مشہور ہے کہ "جنگ کی باتیں میٹھی اور میدان کڑوا ہے"

یہ باتیں کہنے میں تو آسان ہیں مگر اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ اللہ داد نے کہا۔

اللہ داد اخوند! اِس زندگی نے ہمیں دیا کیا ہے، جسے ہم نے اتنا قریب تر بنایا ہے، اگر اللہ کی راہ میں قربان کر دیں تو آخرت میں تو کام آئے گی۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

کیوں یہ کام جو ہم کر رہے ہیں کیا یہ آخرت میں ہمارے کام نہیں آئے گا؟ اللہ داد نے پوچھا۔

کیوں نہیں آئے گا۔ صرف خود کیلئے، جہاد تو پورے عالم اسلام کیلئے فائدہ پہنچائے گا۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

مانتا ہوں تمھاری بات بھی ٹھیک ہے۔ مگر اِسے اُس طرح کی قیادت کی ضرورت ہے جو عوام کو یہ بتا سکے کہ جہاد کے فوائد کیا ہیں؟ ہمارے ہاں تو ہر فرد ہر ایک طبقہ حکمرانی چاہتا ہے۔ مولویوں نے اپنے کام اِس کیلئے چھوڑ دیے ہیں، عام آدمی نے اِس کیلئے اپنا کام چھوڑا ہے، یہ تمام ملک کی خدمت حکمرانی میں دیکھ رہے ہیں۔ اللہ داد نے کہا۔

یار چھوڑو تمھاری باتیں، اگر اتنے ہوشیار ہوتے تو آج مولوی صاحب کی جگہ پر ہوتے۔ مولوی صاحب کی باتیں بھول گئے، فرما رہے تھے کہ اِس وقت قیادت اچھے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ عبدالولی نے اپنی بات پر زور دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہمارا اصل کام یہ ہے کہ علم حاصل کریں، یہ علیحدہ بات ہے کہ نہ تو ہم خود سمجھتے ہیں اور نہ اساتذہ، تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہے، میں نے تو ہر جگہ ہر وقت تمھارا ساتھ نبھایا ہے۔ اور آج بھی تمھارے ساتھ ہوں، آج سے کتاب بند۔ اللہ داد نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

دوسری صبح مدرسہ کا مہتمم بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ وہ آج اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ دیگر طالبان کو بھی بلایا گیا تھا۔ دس طالبان کا ایک گروپ تیار ہو چکا تھا۔ پھر اُس نے دعا کیلئے ہاتھ اُٹھائے۔

یا اللہ! ہم سب آپ کے بندے ہیں، آپ ہی کی عبادت کیلئے پیدا ہوئے ہیں، اور یہ عہد کیا ہے کہ آپ کے احکامات بجالائیں گے، اور دوسرے لوگوں تک پہنچائیں گے، آج وہ دن آگیا ہے کہ ہم دین کا عَلم بلند کریں اور اِس راہ میں اپنی جانوں کا نظرانہ پیش کریں۔ یہ ٹولہ اپنی دربار میں قبول فرما۔ فتح اِن کا مقدر بنا۔ یا اللہ ! وہ ہمت عطا فرما تاکہ دین مبین پر سب کچھ قربان کر سکیں۔ صرف آپ کے دین کی راہ میں نکل رہے ہیں، یا اللہ! اِنہیں قبول فرما۔ آمین۔

دعا کے بعد ہر ایک طالب کو ماتھے پر چوما۔ اللہ داد کی قیادت میں اِنہیں رخصت کیا۔ دو مہینے اُن لوگوں سے جنگ کی ٹریننگ حاصل کی جنہیں پشتو زبان بولنی نہیں آتی تھی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۷)

ولی کے ابا! کتنی بار میں نے آپ سے کہا کہ ولی کا پتہ تو کرواؤ، یہ لڑکا تو جیتے جی غائب ہو گیا۔ کوئی حال نہ احوال۔

پچھلے سال تو کسی نے اُسے مدرسہ کی دستار بندی میں دیکھا تھا، خدا جانے کہ میرا ولی تھا یا کوئی اور؟ عبدالولی کی والدہ نے اپنے شوہر پہلوان سے کہا۔

اچھا ہے کہ غائب ہے۔ اگر وہ ہمارا حال نہیں پوچھتا تو میں کیوں کر اُس کی تلاش کروں۔ پہلوان نے اپنی بیوی سے کہا۔

آپ نے تو اپنے بھائی کی خاطر اُسے گھر سے نکال دیا، اب وہ کس حیثیت سے اِس گھر میں آئے گا۔ بیوی نے کہا۔

باپ ہوں اُس کا، غصہ آگیا ہو گا اُس وقت، وہ تو دین کیلئے گیا ہے تو اُسے پتہ ہونا چاہیے کہ ماں باپ کا کیا حق ہو تا ہے۔ پہلوان نے جواب دیا۔

ھو، ھو، کیا خوب حق ادا کیا ہے جو حق کا دعویٰ بھی کر رہے ہو۔ آپ تو صرف پیدا کرنے میں پہلوان تھے باقی تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عجیب پریشان عورت ہو، ہر چیز کی تمھیں پریشانی ہے، کونسی اُسے بلا نگل لے گی۔ جب دل چاہے گا آجائے گا۔ پہلوان نے بیوی کی بات کاٹ کر کہا۔

پریشان کیوں نہیں ہو نگی، بیٹا ہے میرا، جگر کا خون دے کر پالا ہے اُسے۔ خال دارہ نے روتے ہوئے کہا۔

ختم کرو یہ، ہر وقت تم ہو اور تمھارے آنسو۔ رونے کے سوا تمھیں اور کچھ نہیں آتا۔ دوسروں کا پیٹ کہاں بھرا ہے جو تم ولی کیلئے غمزدہ ہو۔ پہلوان نے غصے میں کہا۔

خدا کیلئے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، رزق تو خدا دیتا ہے، توبہ کرو۔ خال دارہ نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہاں خدا دیتا ہے، خدا کیا آسمان سے اُتارتا ہے۔ تمھیں کچھ پتہ ہے کہ میں کس حال میں ہوں، تم دیکھتی ہو کہ تمام رات کُتوں کی طرح بھونکتا ہوں، صبح پھر میں اور میرا ایلچا، کبھی بھی میں نے آرام نہیں کیا، بھاڑ میں جائیں تمھارے بچے۔ پہلوان نے کہا۔

میرے نہیں ہیں، اگر میں نے اِن کو جَننا تھا تو اپنے باپ کے گھر ہی جَن لیتی، کیوں یوں نہیں کہتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خال دارہ نے بات پوری نہیں کی تھی کہ پہلوان نے اُس کی بات کاٹی۔

اپنی زبان بند رکھو، میرا دماغ مت کھاؤ، آگیا تو ٹھیک ورنہ بھاڑ میں جائے۔ پہلوان نے بات پوری کرنے کی کوشش کی۔

بھاڑ میں جائیں اُس کے دشمن، اللہ کی راہ میں گیا ہے، آپ سے اور آپ کے اُن دوسرے بچوں سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ وہ قرآن کو سمجھتا ہوگا، آپ لوگوں کو تو کلمہ پڑھنا تک نہیں آتا۔ خال دارہ نے فوراً جواب دیا۔

اگر خدا کی راہ میں گیا ہے تو خدا کے سپرد کرو، میرا دماغ کیوں کھاتی ہو۔ یہ کہتے ہی پہلوان کمرے سے باہر نکل گیا۔

پہلوان کے باقی تینوں بیٹے بھی اب جوان ہو چکے تھے۔ احمد خان تو اب مزدوری کرتا تھا۔ باقی دو بھی کام کاج میں مصروف تھے۔ اب پہلوان میں وہ قوت نہ تھی جو پہلے تھی۔ بڑی بیٹی کے رشتہ کیلئے بھی لوگ آرہے تھے۔ پہلوان کا دل چاہ رہا تھا کہ بیٹی کا رشتہ پکا کرے، مگر خال دارہ نہیں مانتی تھی۔ کیونکہ اُس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی بیٹی وٹہ سٹہ پر دے گی۔ وہ بھی عبدالولی کیلئے۔ لیکن عبدالولی کا کوئی اتہ پتہ معلوم نہ تھا، نہ زندگی کا نہ موت کا۔

پہلوان گھر سے نکلنے کے بعد سیدھا مسجد گیا۔ نماز کے بعد مولوی صاحب کے کمرے (حجرہ) میں گیا۔

السلام علیکم! پہلوان نے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

وعلیکم السلام ! آؤ پہلوان، دروازے میں کیوں کھڑے ہو۔ آؤ بیٹھو۔ مولوی صاحب نے کہا۔

پہلوان نے بھی جوتے اُتارے اور کمرے میں جاکر مولوی صاحب کے قریب بیٹھ گیا۔

پہلوان کیاحال ہے، بال بچے ٹھیک ہیں، اور عبدالولی کا کچھ پتہ چلا؟ مولوی صاحب نے پہلوان سے پوچھا۔

مولوی صاحب ! اللہ کا شکر ہے بچے ٹھیک ہیں، رات کا نوالہ مل جاتا ہے، وہ ولی کی امی۔۔۔۔

مُنہ میں خاک۔ نہ آدمی تھے اور نہ بنوگے۔ ولی کوئی نام ہے جو تم نے لیا، پورانام کیوں نہیں لیتے۔ آدھا نام لینا یا پھر نام بگاڑنا گناہ ہے۔ کتنی بار تم لوگوں سے کہا ہے تم لوگ سمجھتے نہیں۔ مولوی صاحب نے پہلوان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ہاں وہ عبدالولی کی ماں کیا کہتی ہے۔ مولوی صاحب نے پہلوان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں کہہ رہا تھا کہ عبدالولی کی ماں پریشان ہے، عبدالولی کا کوئی اتہ پتہ معلوم نہیں، پہلے تو حال احوال تھا، اب جب ہم ملنے جاتے ہیں تو وہ وہاں سے جاچکا ہوتا ہے۔ اب تو بیس سالوں سے کوئی حال احوال نہیں۔ پہلوان نے اپنی بات پوری کی۔

میں آس پاس معلوم کراتا ہوں، جس مدرسہ میں بھی تھا معلوم ہو جائے گا۔ پرسوں جمعہ ہے، نزدیک کے گاؤں کے مدرسہ میں دو مدارس کے کچھ علماء آرہے ہیں، اُن سے بھی معلوم کرلونگا۔ تم اُس کی ماں کو تسلی دو۔ مولوی صاحب نے کہا۔

پہلوان واپس اپنے گھر آیا۔ عبدالولی کی والدہ خال دارہ کو مولوی صاحب کی باتیں بتائی۔ اُنہیں تھوڑی تسلی ہو گئی۔ دوسری صبح پہلوان کے بھائی کے گھر سے کچھ لڑکیاں دعوت دینے

(c) ketabton.com: The Digital Library

کیلئے پہلوان کے گھر آئیں۔ خال دارہ اور اُس کی بیٹی کو بھی دعوت دی کہ جمعہ کے دن سلیم کی منگنی ہے آپ لوگ ضرور آئیں۔ سلیم کی بہن مرجان تو اتنی خوش تھی کہ پورے گاؤں کو اس منگنی میں مدعو کرے۔ دن رات ناچ گانا اور طبل بجائے۔ بختاور نے جب مرجان کا یہ جوش دیکھا تو اُن سے کہا

مرجان! آج تو تم بہت خوش ہو، خوشی کے مارے پھولے نہیں سمارہی۔

کیوں خوش نہیں ہو نگی۔ بڑے بھائی کی منگنی ہے، دل چاہ رہا ہے کہ دن رات ناچوں، بہنیں تو یہ دن خدا سے مانگتی ہیں۔ مرجان نے اُسی جوش میں کہا۔

کس کا ہاتھ مانگا ہے؟ بختاور نے پوچھا۔

وہ ساتھ والے گاؤں کے ملک صالح کی بیٹی زرقا ہے۔ بہت امیر لوگ ہیں۔ اور لڑکی، وہ تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ مرجان نے فخریہ انداز میں کہا۔

دولت اور خوبصورتی کو کیا کروگی، اللہ سیرت اچھی کرے۔ خال دارہ نے کہا۔

چچی آپ کو کیا پتہ، آج کل لوگ لڑکی کے سگڑپن کو نہیں صورت کو دیکھتے ہیں، پھر میرے بھائی سلیم کو دیکھو، وہ کوئٹہ میں پڑھ رہا ہے۔ وہی نوکری ہوگی، اب بھی وہ ایک جگہ نوکری کر رہا ہے، بہت بڑی تنخواہ دے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اپنے ساتھ لے جائے، ہو سکتا ہم بھی شہر چلے جائیں۔ شہر میں تو اس طرح کے کام نہیں ہوتے جیسے یہاں گاؤں میں ہیں۔ مرجان نے جواب دیا۔

خدا نہ کرے کہ ماں باپ سے علیحدہ ہوں۔ ماں باپ تو لڑکے اس لیے نہیں مانگتے کہ وہ شادی کر کے علیحدہ ہو جائیں، نرینہ اولاد تو ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں۔ خال دارہ نے جواب دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

چچی! میرے والدین کو تو کسی چیز کی کمی نہیں۔ سب کچھ بہت ہے۔ سلیم نے جو اتنی پڑھائی کی ہے وہ تو اُسے گاؤں کی خاک کے ساتھ نہیں ملا سکتا۔ مرجان نے اپنی چچی کو یوں جواب دیا جیسے وہ بہت جانتی ہو۔

آپ لوگ باتیں کریں میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ بختاور اٹھتے ہوئے بولی۔

نہیں جانے دو، ہم دعوت دینے نکلے ہیں دیر ہو جائے گی۔ مرجان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

بختاور تم بھی ہمارے ساتھ چلو، آخر تمھارا بھی تو چچیرا ہے۔ اتنا حق تو بنتا ہے۔ گاؤں کی ایک لڑکی نے بختاور سے کہا۔

بختاور نے مرجان کی طرف دیکھا مگر اُس نے لڑکیوں سے کہا۔ چلو بھئی دیر ہو رہی ہے اور بھی بہت سے کام باقی ہیں۔

پھر خال دارہ کو متوجہ کر کے کہا، چچی! آپ اور بختاور ضرور آنا۔ پھر لڑکیوں کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔

خال دارہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بیٹی نے جب ماں کو دیکھا تو اس کا دل بھی بھر آیا اور ماں سے لپٹ گئی۔ ہم بھی طالب لالا کی منگنی کریں گے۔ میں اور گل پانڑا اسی طرح دعوت دینے نکلیں گی۔ بختاور نے اپنی ماں سے کہا۔

ہماری یہ قسمت کہاں بیٹا۔ ہماری قسمت میں تو صرف مشقت لکھی ہے۔ نا پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور نا ہی اپنی خوشی دیکھ سکے۔ بس اللہ نے ہمیں دوسروں کی خوشی میں برتن دھونے کیلئے پیدا کیا ہے۔ خال دارہ کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔

کیوں نہیں دیکھیں گے۔ اللہ تو صرف اِن کا نہیں ہے۔ اللہ نے کیا تو طالب لالا مولوی بن کر آجائے گا، تمام خوشیاں وہ اپنے ساتھ لے آئے گا۔ بختاور نے اپنی ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

آمین۔ تمھارے منہ میں گھی شکر۔ خال دارہ نے رونے کے انداز میں کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

جمعہ کے دن سلیم کی منگنی دھوم دھام سے ہوئی۔ باہر ڈھول اور گھر میں طبل بج رہے تھے۔ ہر طرف علاقائی رقص (اتنڑ) تھا۔ پہلوان اور اُس کے بیٹے لوگوں کی خدمت کر رہے تھے۔ مبارک باد دینے کیلئے آئے ہوئے لوگوں کے سامنے چائے پیش کر رہے تھے۔ پہلوان کا بھائی لعل محمد گرچہ پہلوان سے چھوٹا تھا مگر دولت نے اُسے بڑا بنایا تھا۔ گاؤں کے لوگ بھی پہلوان کو چھوٹا اور لعل محمد کو بڑے کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ دو دن بعد مولوی صاحب آگئے، انہوں نے پہلوان کو اپنے کمرے میں بُلایا۔

پہلوان ! مبارک ہو تمھارے بیٹے کا پتہ چل گیا ہے۔ مولوی صاحب نے پہلوان کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

خدا آپ کا ایمان سلامت رکھے، کہاں ہے وہ، کیسا ہے۔ پہلوان بے چین ہوا۔

وہ مہینہ ہوا کہ طالبان کے ساتھ افغانستان گیا ہے۔ مولوی نے خوش ہوتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا۔

افغانستان گیا ہے، طالبان کے ساتھ؟ پہلوان نے حیران ہو کر مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔

پہلوان! تم خوش قسمت ہو، کہ عبدالولی جیسا بیٹا اللہ نے دیا ہے۔ اِس جیسے بیٹے اللہ ہر کسی کو دے۔ مولوی صاحب نے پہلوان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

افغانستان میں وہ کیا کر رہا ہے، طالبان افغانستان بھی جاتے ہیں؟ پہلوان نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

تم بھی کمال کرتے ہو، تمھیں تو کچھ بھی پتہ نہیں، لوگوں سے تو سنا ہو گا۔ پہلوان! طالبان افغانستان میں اسلامی حکومت بنا رہے ہیں۔ جہاد میں مصروف ہیں، یہاں سے بھی طالبان جا رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا۔

تو پھر مولوی صاحب! درس کا کیا ہوا؟ پہلوان نے پوچھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

درس کہیں نہیں بھاگا جارہا، اِس وقت جہاد کی بہت سخت ضرورت ہے۔ اور اس طرح کی جوانوں کی ضرورت ہے جیسے عبدالولی جسے دین کا بھی پتہ ہے۔ مولوی نے کہا۔

وہ تو کہہ رہے تھے کہ افغانستان میں جہاد ختم ہو گیا ہے، کافروں کو انہوں نے بھگا دیا ہے اور مجاہدین نے افغانستان پر قبضہ کرلیا ہے، تو پھر یہ کونسا جہاد ہے؟ کیا افغانستان میں پھر سے کافر آگئے ہیں؟ پہلوان نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

پہلوان! یہ لوگ کافروں سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں، ہر جگہ ڈورے ڈالے لوگوں کو لوُٹ رہے ہیں۔ نہ مرد دیکھتے ہیں نہ عورت، نہ دن نہ رات، جس کے پاس بندوق ہے اور کچھ لوگ، بس وہ بادشاہ ہے۔ جو دل میں آیا وہی کرتے ہیں۔ اِن طالبان کو اللہ فتح یاب کرے یہ تو اِن ظالموں کے خلاف کھڑے ہوئے ہیں۔ اُن ڈاکوؤں کے خلاف جنہوں نے بڑی شاہرائیں قبضہ کر رکھی ہیں۔ جو لوگوں کے گھروں کو لوٹتے ہیں، کسی کی عزت محفوظ نہیں، اِن سب سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلیئے افغانستان میں اسلامی نظام لایا جارہا ہے اور پھر یہ روشنی اللہ ہم تک بھی پہنچادے گا۔ مولوی صاحب نے پوری تقریر کرڈالی۔

پہلوان کو مولوی صاحب کی ایک بات بھی سمجھ نہیں آرہی تھی، بس اتنا سمجھ گیا کہ عبدالولی مدرسہ چھوڑ کر افغانستان جہاد کیلیئے گیا ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۸)

عبد الولی اللہ داد کی قیادت میں آگ جیسے گرم میدان جنگ تک پہنچ گیا۔ پہلی بار جب وہ قندہار پہنچے تو انہیں ایک دفتر لے جایا گیا۔ وہاں ایک طالب بیٹھا لوگوں کے مسائل سُن رہا تھا۔ پھر وہ دوسرے ساتھیوں کو حکم دیتا، جیسے ہی اِن پر نظر پڑی تو کہا، آپ لوگ تھوڑا سا انتظار کریں جیسے ہی میں فارغ ہو جاؤں تو پھر گپ شپ کریں گے۔

عبد الولی اور اللہ داد یہی دفتر میں بیٹھے رہے باقی ساتھی باہر بیٹھ گئے۔ اِن کیلئے سبز قہوہ چائے ٹافیوں سمیت لائے گئے۔ اسی اثنا ایک شخص کاغذ ہاتھ میں لیے دفتر کے اندر داخل ہوا۔

السلام علیکم!

وعلیکم السلام۔ طالب نے جواب دیا۔

کہو کیسے آنا ہوا۔

صاحب یہ ایک عرض ہے اگر آپ اس پر غور فرمائیں۔ شخص نے کہا۔

کیسی عرض؟ کہو کیا بات ہے۔ طالب نے پوچھا۔

یہ لیں جی! اس کاغذ میں لکھا ہے۔ شخص نے کاغذ آگے کیا۔

تم لوگ کبھی نہیں سدھرو گے، پھر وہی یہود و نصاریٰ کے کام۔ طالب نے شخص کو غصے سے کہا۔

صاحب! میں نے تو ایسا کوئی کام نہیں کیا، میں تو لیسہ (سکول) میں معلم ہوں۔ شخص نے بڑی عاجزی سے کہا۔

یہ کیا ہے؟ طالب نے شخص کے ہاتھ سے کاغذ چھینا۔ یہ ہیں نصاریٰ کے کام۔ کاغذ پر عرضداشت لکھتے ہو۔ طالب نے کاغذ پھاڑ دیا۔

میں تمھارے سامنے بیٹھا ہوں کہو کیا مشکل ہے، اسی وقت تمھارا کام ہو جائے گا۔ اس کا کیا مطلب؟ اگر کاغذ کے لوگ کام کرتے تو یہ ملک اس طرح برباد نہ ہوتا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

شخص نے اپنی عرض پیش کی۔ جب باہر نکل گیا تو باہر بیٹھے عبدالولی کے ساتھ آئے ہوئے طالبان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

میرا خیال ہے یہ سفید کبوتر ہیں جو اُس درخت میں بیٹھے ہیں۔

نہیں ! یہ کبوتر نہیں، سفید کونج ہیں۔ میرے خیال سے کوئی انکا شکار نہیں کرتا۔ دوسرے نے کہا۔

یہاں کسی کا باپ بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم دیکھ نہیں رہے ہر کوئی اپنے راستے پر سیدھا جارہا ہے۔ ایک اور طالب نے کہا۔ جو شخص ان کے سامنے چائے رکھ رہا تھا وہ مسکرایا اور کہا۔

ناہی یہ کبوتر ہے اور ناہی کونج۔ یہ تو اس دفتر کے کاغذات ہیں جو صاحب نے ادھر پھینکے ہیں۔ جب صاحب اس دفتر میں آئے تو کوئی دس دن ہوئے کہ یہ تمام کاغذات پھینک دیے۔ ابھی ان درختوں پر لٹک رہی ہیں۔ چائے والے شخص نے کہا۔

معلم صاحب نے جب ان کاغذوں کو دیکھا تو انہیں ٹھیس سی پہنچی۔ کیونکہ ان کے پاس بھی لوگ آئے تھے کہ جب تک ہم پوری طرح حکومت حاصل نہیں کرلیتے تمھیں یہ لیسہ (سکول) بند کرنا ہوگا۔ معلم صاحب کا خیال تھا کہ جو لوگ ان کے پاس آئے تھے شاید وہ اپنے طور سے آئیں ہونگے۔ اس لیے انہوں یہاں عرضی پیش کی۔

جو طالب دفتری امور سنبھال رہا تھا انہوں نے اللہ داد اور عبدالولی سے کہا کہ تم لوگ اپنے ساتھیوں سمیت اس معلم کے لیسہ جاؤگے جو ابھی یہاں سے گیا ہے۔ وہاں تم لوگ اپنا اوطاق بناؤ پھر انشاء اللہ قائدین کی رائے کے مطابق تم لوگوں کو آگے کی حکمت عملی بتائی جائے گی۔

لیسہ میں کیسے اوطاق بنائیں، وہاں تو بچے پڑھ رہے ہونگے۔ اللہ داد نے پوچھا۔

یہ لیسہ تو مجاہدین نے ہی بند کیا تھا۔ یہاں تو وہ چرس وغیرہ اور دوسرے تماشے کیا کرتے تھے۔ پھر اس معلم نے کہا کہ وہاں اب کوئی نہیں، دو مہینے ہوئے ہیں کہ پھر سے لیسہ شروع

(c) ketabton.com: The Digital Library

کرادیا گیا ہے۔ جب تک ہم از سر نو درسی نصاب نہیں بناتے تب تک ان سے اوطاق کا کام لے سکتے ہیں۔ پکے کمرے ہیں اُس میں۔ طالب نے کہا۔

یہ لیسہ کسے کہتے ہیں؟ عبدالولی نے پوچھا۔

سکول کو یہاں لیسہ کہا جاتا ہے۔ اللہ داد نے جواب دیا۔

یہ تو اچھی بات ہے، سکول کی کیا ضرورت، ہم تو وہاں اِن لوگوں سے تنگ آچکے ہیں، ہمارا مذاق اڑاتے ہیں، فضول ناموں سے پکارتے ہیں۔ آپ نے اچھا فیصلہ کیا ہے۔ عبدالولی نے کہا۔

حافظ صاحب! وہاں کی بات اور، اور یہاں کی بات اور ہے۔ اللہ داد نے کہا۔

آپ لوگ وہاں جائیں میں ایک آدمی کو آپ کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ طالب نے ان کی بات کاٹ دی۔

پھر اِس نے ایک شخص کو بلایا، وہی شخص جو چائے پیش کر رہا تھا اُس نے کہا کہ تم ان لوگوں کو آج رات اخوند صاحب کے ہاں لے جاؤ، وہاں جگہ کم ہے مگر اُن سے کہنا کہ آج رات انہیں اپنے ہاں ٹھہرائے، کل صبح انہیں لیسہ لے جانا ہے۔

دوسری صبح یہ لوگ لیسہ آگئے۔ لیسہ کی عمارت گرچہ خراب ہو چکی تھی پھر بھی انہوں نے کچھ مرمت وغیرہ کی تھی۔ دیواروں پر علم کے بارے میں اقوال تازہ تازہ لکھے گئے تھے۔ یہ اقوال سفید چارٹ پر لکھے گئے تھے۔

علم روشنی ہے۔ جہالت اندھیرا ہے۔

آؤ اپنے ملک کی خدمت قلم کے ذریعے کریں۔ بندوق پھینک دیں وغیرہ وغیرہ۔

انہوں نے معلم صاحب اور بچوں کو رخصت کیا اور اپنا ٹھکانا بنایا۔ اور لوگ بھی یہاں آتے اور یہاں سے آگے اپنے کام کیلئے بھیجے جاتے۔ عبدالولی اور اُس کے ساتھی بھی کچھ دنوں بعد میدان جنگ بھیج دیے گئے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۹)

اللہ داد اور عبدالولی ہر میدان جنگ میں بڑی دلیری سے لڑے۔ پورے ڈیڑھ دو سال مختلف محاذوں پر رہے۔ تحریک طالبان کامیابی کے ساتھ اس وقت بہت آگے تک بڑھ چکی تھی۔ ان دونوں کو واپس قندہار بھیجا گیا۔ وہاں امن و امان قائم کرنے انہیں ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

عبدالولی اپنے اوطاق میں اپنے بستر کے تکیہ پر بیٹھا گھٹنوں میں سر رکھے گہری سوچوں میں گم تھا۔ دو سال ہونے کو تھے کہ یہاں آئے۔ ان دو سالوں میں اُس نے بہت کچھ سنا اور بہت کچھ دیکھا۔ دشتِ لیلیٰ کے شہید اور اُن کا جذبہ۔ جو دس ساتھی یہاں آئے اُن میں صرف تین رہ گئے تھے۔ ایک عبدالولی دوسرا اللہ داد اور تیسرا ایک اور ساتھی۔ ان کے تین ساتھیوں نے دشتِ لیلیٰ میں جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ اور باقی چار ساتھی دوسرے محاذوں پر شہید ہوئے تھے۔ دشتِ لیلیٰ میں ان کا ساتھی اللہ نور جو کہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا بڑی بے رحمی سے مارا گیا تھا۔ جب انہیں کمانڈر مالک نے راستہ دیا وہ آگے بڑھنے لگے تو اُزبک ملیشا کی جال میں پھنس کر مارا گیا۔ عبدالولی کی حالت بھی بہت گھمبیر تھی اور اللہ نور شہید ہوا۔ عبدالولی اتنا بے بس تھا کہ وہ اللہ نور کو دفنا بھی نہ سکا۔ اللہ نور کی موت داغ ایسا گہرا تھا کہ عبدالولی بھولے نہیں بھول پارہا تھا۔ ان کی قربانیاں رنگ لارہی تھی۔ تحریک طالبان کابل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ امکان یہی تھا کہ بہت جلد افغانستان کا دارالحکومت کابل ان کے قبضہ میں آجائے گا۔ عبدالولی جو نفرت اپنے ساتھ لایا تھا اُس کی برکت سے طالبان میں بڑا نام کمایا تھا۔ کیونکہ نہ تو اُس کے پاس دل تھا اور نہ ہی وہ کسی پر رحم کھاتا۔

میرے خیال سے گھر یاد آرہا ہے۔ جو اس طرح گہری سوچ میں گم ہو۔ اللہ داد جو تھوڑی دیر پہلے آیا تھا عبدالولی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

ہونہہ، گھر۔۔۔ گھر کیا ہوتا ہے۔ کیسا ہوتا ہے۔ اس سے ہمارے جیسے لوگ انجان ہوتے ہیں۔ گھر تو اُن کے ہوتے ہیں جو گھروں میں پلے بڑے ہوں۔ ہم تو حجروں میں رہنے والے،

(c) ketabton.com: The Digital Library

دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والے ہیں۔ ہمارے گھر تو حجرے ہیں اور حجروں کی کمی یہاں نہیں ہے۔

آج تو بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو۔ اللہ داد عبدالولی کے قریب بیٹھ گیا۔ خیر ہے رات کو کیا خواب دیکھا تھا۔ اللہ داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

تم بھی بادشاہ ہو اللہ داد اخوند۔ خواب تو وہ دیکھتے ہیں جنہیں نیند آتی ہے۔ میں تو صرف سو جاتا ہوں اور بس۔ خوابوں کی دنیا انسان کو حقیقت سے دور کرتی ہے۔ حقیقت کیا وہ تو جنت سے بھی دور کرتی ہے۔ عبدالولی نے کہا۔

عبدالولی اخوند! کئی سال ہم نے اکٹھے گزارے، مدرسہ کے سرد کمرے سے لے کر اس گرم میدانِ جنگ تک۔ مگر میں تمھیں آج تک نہیں پہچان سکا۔ اللہ داد نے کہا۔

مجھے نہیں پہچانا! میں عبدالولی۔ عبدالولی زور زور سے ہنسنے لگا۔ یار اللہ داد تم بھی کمال کرتے ہو کہ مجھے نہیں پہچانا۔ تو مجھے پہچان لو۔ نام عبدالولی، ولد داد محمد۔ مدرسہ میں دوسروں کے ٹکڑوں پر پلا بڑا ہوں۔ تمھارے سوا میرا کوئی اور دوست نہیں اور بس۔

عبدالولی اخوند! میرا یہ مطلب نہیں۔ عبدالولی کو تو اب ہر طالب جانتا ہے۔ حافظ قرآن عبدالولی۔ جس پہچان کی میں بات کر رہا ہوں وہ کچھ اور ہے۔

کیسی پہچان؟ اللہ داد اخوند میں کچھ سمجھا نہیں۔ عبدالولی نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے سنا ہے کہ جس کے سینے میں قرآن ہو وہ بہت رحم دل ہوتا ہے۔ صلہ رحمی رکھتا ہے، اس طرح کے لوگ بہت نرم اور رحم دل ہوتے ہیں۔ جب کہ تمھارا دل مجھے پتھر سے بنا لگتا ہے جس پر نہ کسی کے آنسو اثر کرسکتے ہیں اور نہ کسی کی فریاد۔ اللہ داد نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

میرا دل پتھر کا ہے۔ کیا وجہ ہے۔ تم کیوں یہ سوچتے ہو۔ میں نے تو تمھیں کچھ۔۔۔۔۔۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

نہ، نہ۔ اللہ داد نے عبد الولی کی بات کاٹی۔ تم نے مجھے ہمیشہ بڑے بھائی کی نگاہ سے دیکھا۔ میں نے تمھاری آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے ہیں۔ اللہ نور کی شہادت پر آج بھی جب اللہ نور کا ذکر چھڑتا ہے تو تمھاری آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔ اللہ داد نے عبد الولی کے شکوک دور کیے۔

تو پھر تم نے یہ بات کیوں کہی؟ عبد الولی نے پوچھا۔

جب تمھارے کاندھے پر کلاشنکوف ہوتی ہے اور تم ڈیوٹی پر ہوتے ہو یا پھر میدان جنگ میں جہاد کر رہے ہوتے ہو تو اُس وقت میں نے محسوس کیا ہے جیسے تمھارے سینے میں دل نہیں پتھر ہو۔ عورتوں سے تمھاری نفرت دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔ اگر وہ بیچاری برقعہ میں بھی ہوتی ہیں تو تم اُنھیں نہیں چھوڑتے۔ اور اگر وہ بنا مُنہ چھپائے دکھائی دیں تو تمھارے چہرے کی رنگت اُڑ جاتی ہے جیسے عورت تمھاری سب سے بڑی دشمن ہو۔ اور جوانوں سے بھی تمھارا رویہ اِسی طرح ہے جو سکول پڑھتے ہیں۔ اللہ داد نے وجہ کی نشاندہی کر دی۔

عبد الولی زور زور سے ہنسنے لگا۔

یہ صرف میرا نہیں تمام طالبان کا مسئلہ ہے۔ اللہ داد اخوند! یہ دونوں فتنے ہیں فتنے۔ یہ جتنی جلدی ختم کرو گے اُتنی جلدی کامیابی حاصل کرو گے۔ یہ انسان کو بے راہ کرتے ہیں۔ تم نے سنا ہو گا کہ عورت شیطان کی ذات سے ہے۔ سمجھے کہ نہیں۔ عبد الولی نے اپنا جواز پیش کیا۔

شرم کرو، تم بھی جاہلوں جیسی باتیں کرنے لگے ہو۔ عورت شیطان کی ذات سے ہے یہ کیا بات ہے جو تم نے کہی۔ افسوس اُس درس کا جو تم نے لیا تھا۔ اللہ داد نے مایوسی میں کہا۔

اللہ داد اخوند! ہر جگہ اِسی کی وجہ سے فساد پھیلا ہوا ہے۔ بابا آدم کس کے کہنے پر جنت سے محروم ہو گئے؟ عبد الولی نے پوچھا۔

واہ، اچھی دلیل ڈھونڈی ہے۔ عورت تو خدیجہؓ بھی تھیں۔ عائشہؓ بھی تھیں، ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اللہ داد نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

کیوں گنہگار کرتے ہو، گنہگار ہو جائیں گے، چھوڑو یہ باتیں۔ عبد الولی نے جان چھڑانے کیلئے کہا۔

اپنی ماں اور بہن کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اللہ داد نے پھر پوچھا۔

مجھے میری ماں اور بہن کے پاس کسی نے چھوڑا ہے، اُن کا پیار میری قسمت میں کہاں، میری تو ساری زندگی تمھارے ساتھ گزری ہے۔ عبد الولی نے کہا۔

میرے خیال میں تم اِن سب کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔ اللہ داد نے کہا۔

دونوں اور بھی باتیں کرتے کہ اُنہیں خبر پہنچی کہ والی صاحب نے اُنہیں بُلایا ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے عمامے باندھ لیے، والی صاحب کے دفتر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں صوبے کا کمانڈر بھی موجود تھا۔ دوسرے اضلاع کے ذمہ داران بھی آئے ہوئے تھے۔ والی صاحب کی صدارت میں میٹنگ ہوئی۔ والی صاحب عبد الولی سے بہت خوش ہے۔ ایک ضلع کے امیر نے اپنے ضلع کیلئے عبد الولی کی خدمات چاہیں۔ والی صاحب نے اُن کی بات مان لی۔ اور عبد الولی کو اس ضلع کی " امر بی المعاروف و نهي عن المنكر " کی امارت سونپی گئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ نئے آئے ہوئے طالبان کی ذمہ داری بھی دے دی گئی۔ والی صاحب نے اُن سے کہا کہ حافظ صاحب! کچھ نئے طالبان آئے ہیں کل ان کے ساتھ ایک نشست کر لیں۔ جہاد کی فضیلت اور تحریک کے مقاصد کے بارے میں اُنہیں اچھی طرح سمجھائیں۔ یہ کام اب تمھارے ذمے ہے۔ جب تک وہ میدان جنگ کیلئے تیار نہیں ہوتے اُنہیں ذہنی طور پر تیار کرنا تمھاری ذمہ داری ہے۔ اللہ داد نے والی صاحب جو کہ ایک سنجیدہ اور مولوی تھے سے پوچھا۔ والی صاحب! اگر یہ ذہنی تیاری کا کام آپ جیسے عالم فاضل شخص خود کرے اچھا نہیں ہو گا۔ عبد الولی اخوند جوان ہے اور پھر اس نے علم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

یہ کام ہے جوان کا۔ اور پھر عبدالولی کو طالبان میں قدر کی نگاہ دیکھا جاتا ہے۔ یہ کام اچھی طرح سرانجام دے سکتا ہے۔ میدان جنگ میں علم کی نہیں جنگی ہنر اور جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے۔اور یہ چیز مجھے عبدالولی میں نظر آرہی ہے۔والی صاحب نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

اللہ داد گرچہ والی کی باتوں سے متفق نہیں تھا پھر بھی ہاں کے انداز میں سر ہلا دیا۔

صوبائی دفتر سے جب وہ باہر نکلے تو اللہ داد نے عبدالولی سے کہا۔

عبدالولی اخوند! تم سمجھتے نہیں کہ تمھیں بہت بڑی ذمہ داری سونپی گئی ہے، کیا پورا کر پاؤگے ؟

اللہ داد اخوند! تمھیں تو خوش ہونا چاہیے تمھارے دوست کو اختیارات حاصل ہوئے ہیں۔ اب دیکھو میں کیسے اپنی ذمہ داری اچھی طرح سرانجام دیتا ہوں۔ عبدالولی اپنے نئے عہدے پر بہت خوش تھا۔

عبدالولی اخوند میں سمجھا نہیں؟ کونسے اختیارات، کن اختیارات کی بات کر رہے ہو؟اللہ داد کچھ پریشان سا ہوا۔

یہ اختیارات، کہ لوگوں کو بُرائی سے منع کروں اور اچھائی کی طرف بُلاؤں۔ عبدالولی کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی اُبھری۔

تمھیں پتہ بھی ہے کہ یہ ذمہ داری کتنی دانائی اور احتیاط کی حامل ہے۔

اللہ داد کچھ کہنا چاہتا تھا کہ عبدالولی نے بیچ میں بات کاٹ ڈالی۔

کیوں مجھے جاہل سمجھتے ہو، یا پھر میں بے راہ ہوں۔ اور کسی چیز کا علم نہیں رکھتا۔ تم بھی عام لوگوں کو طرح طالب کو جاہل کی نظر سے دیکھتے ہو۔ عبدالولی نے اپنی ذہنی حالت کی نشاندہی کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ تمھارا یہ خیال غلط ہے۔نہ میں تمھیں جاہل سمجھتا ہوں اور نہ لوگ طالبان کو جاہل سمجھتے ہیں۔ یہ صرف ہمارے طالبان کا گمان ہے کہ لوگ ہمیں جاہل سمجھتے ہیں اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

چاہیئے بھی یہی کہ لوگ ہمیں جاہل سمجھیں۔ تم یہ مانتے ہو کہ تم حافظ قرآن ہو؟ اللہ داد نے سوالیہ انداز میں کہا۔

اس میں کوئی شک؟

میں مانتا ہوں۔ اللہ داد نے کہا۔

اُس کے بعد ارشاد الصرف تک کتابیں پڑھیں۔ یہ ایک حقیقت ہے تم صرف حافظ قرآن ہو، قرآن کو سمجھتے تو نہیں۔ اُس کی معنیٰ کو نہیں سمجھتے۔ سمجھتے ہو؟ اللہ داد نے پوچھا۔

یار اللہ داد اخوند! اچھا بُرا کون نہیں سمجھتا۔ اس میں قرآن کو سمجھنا یا پھر حدیث کو سمجھنا ضروری تو نہیں۔ میں کوئی شیخ الاسلام تو نہیں بنا، اتنا سمجھتا ہوں کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا۔ یہ سب مدرسہ میں سیکھا ہے۔ نیکی اور گناہ میں کیا فرق ہے۔ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے۔ یہ تمام عبد الولی نے اپنی دلیل کے طور پر کہے۔

تم نے بڑا آسان کر دیا۔ تمھیں جو ذمہ داری سونپی گئی ہے وہاں اچھا بُرا، گناہ نیکی نہیں۔ اسے تو ایک عام شخص بلکہ ایک بچہ بھی سمجھتا ہے۔ تمھاری ذمہ داری ہے کہ تمھیں قرآن و حدیث کے بارے میں علم ہونا چاہیئے۔ دینی و عصری علوم کے بارے میں علم ہونا چاہیئے۔ یہ بات صرف عبادت تک محدود نہیں، اس میں معاملات آتے ہیں، اور معاملات کے بارے میں مجھے پتہ ہے کہ تمھاری سوچ کیا ہے۔ اللہ داد نے بات کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

میری سوچ کیا ہے؟ کیا میں نے لوگوں کو تکلیفیں پہنچائی ہیں۔ کسی کا مذاق اُڑایا ہے، کسی کے ہاتھ سے نوالہ چھینا ہے یا پھر کسی کو کام سے روکا ہے۔ مجھے جو اچھا لگا ہے میں نے وہ کیا ہے۔ عبد الولی نے کچھ غصے سے کہا۔

میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ تمھاری سوچ اچھے اور بُرے کا میعار نہیں ہے۔ تمھاری سوچ اگر اچھی ہو تو وہ کرتے ہو، اسلامی فکر سے زیادہ تم پر اپنی سوچ کا غلبہ ہے۔ اللہ داد نے جواب دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

کیوں میری سوچ اسلامی نہیں یا میں کسی اور سوچ کا مالک ہوں۔ اس کا مطلب یہ کہ جس نے میری سوچ پر اعتماد کیا وہ بھی غلط تھے۔ ہم سب کی سوچ خالص اسلامی ہے۔ اور پھر میری تو ساری زندگی مدرسہ میں گزری ہے، اسلامی ماحول میں، تمھارے سامنے۔ پھر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو۔ عبدالولی نے اُسی لہجے میں کہا۔

اسلامی ماحول میں یا پھر روایتی ماحول میں؟ اللہ داد نے پوچھا۔

کیا مطلب اسلامی اور روایتی ماحول؟ عبدالولی نے پھر پوچھا۔

خیر چھوڑو عبدالولی اخوند، تم جذباتی ہوگئے ہو۔ یہ باتیں یہیں چھوڑ دیتے ہیں پھر کسی دن اس پر بحث کرینگے۔ اب چلو کھانا کھائیں۔ اللہ داد نے عبدالولی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میرے تو یار ہو یار، حجرے کے یار۔ دونوں ہنسنے لگے۔

رات جب عبدالولی اپنے بستر پر لیٹا تو ایک خوش گوار احساس اُس کے ساتھ تھا۔ بہت خوش تھا۔ گزرا وقت ایک فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے سے گزرا۔ جن شرائط پر اُس نے زندگی گزاری تھی، جو مشکلات اُس پر گزری تھیں وہ تمام اُس کی آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ گھر گھر جانا، وظیفے اکٹھا کرنا۔ وظیفہ سے زرقا یاد آگئی۔ زرقا کی معصوم صورت، چمکتی آنکھوں میں اپنے پن کا احساس، شریک غم برتاؤ۔

اب زرقا کہاں ہو گی؟ ایک دم ذہن میں یہ سوال اُبھر آیا۔

اپنے گھر ہو گی اور کہاں ہو گی۔ اپنے سوال کا خود جواب دیا۔

گھر میں کیا کر رہی ہو گی؟

اپنا گھر ہو گا، شادی بھی کر لی ہو گی۔

اس سوال کے ساتھ ہی اچانک مُنہ سے نکل گیا۔

نہیں، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ایک دم وہ اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

کیا نہیں ہو سکتا؟ اللہ داد جو اُس کے ساتھ کمرے میں سو رہا تھا نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

خواب دیکھا ہے یا پھر ایسے ہی سر چکرا گیا ہے۔ اللہ داد نے پھر پوچھا۔

کچھ نہیں یار، تم سوجاؤ، سوچ رہا تھا کہ اچانک۔۔۔۔۔۔۔۔

اچانک دل کی بات زبان پر آگئی۔ اللہ داد نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

غلط تو نہیں کہہ رہانا؟ اللہ داد نے اُس کی طرف دیکھا۔

اللہ داد اخوند! تم طالب ہو کہ جِن، جو دماغ میں بھی پھرتے رہتے ہو۔ عبدالولی نے اللہ داد کی باتوں کی تائید کی۔

جِن نہیں یار ہوں تمہارا، استاد ہوں تمھارا، دل ہو میرے، آنکھ ہو میری۔۔۔۔۔

بس، بس ایک تو تمھاری شاعری۔ عبدالولی واپس اپنے بستر پر لیٹ گیا اور اللہ داد بھی سو گیا۔

عبدالولی جس وقت بچہ تھا جب پہلی بار وہ مسجد پڑھنے گیا تھا اُس وقت سے وہ ایک خواب مسلسل دیکھتا آرہا تھا۔ ایسا خواب جس میں عبدالولی کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایک بڑے ٹیلے پر چڑھ جاتا ہے، یہ کبھی ٹیلہ ہوتا ہے تو کبھی پہاڑی نما۔ کبھی کبھار تو ایسے ہوتا ہے کہ ایک اونچی چھت پر چڑھتا ہے۔ چھت پر جب چڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو آدھے تک بڑی احتیاط کے ساتھ چڑھتا ہے۔ نیچے جب دیکھتا ہے تو ایک بڑی کھائی ہوتی ہے۔ وہ ڈر جاتا ہے اور اپنے ہاتھ اور مضبوط کرلیتا ہے۔ پھر نہ نیچے واپس اُتر سکتا ہے اور نہ اُوپر چڑھ سکتا ہے۔ بہت کوشش کرتا ہے کہ اُوپر چڑھ جائے یا پھر نیچے اُتر جائے۔ اسی کشمکش میں ہاتھ پھسل جاتے ہیں اور نیچے گر جاتا ہے۔ زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی جاگ اُٹھتا ہے۔ دوسرا یہ خواب بھی اُس نے بچپن میں دیکھا تھا۔ جب وہ گھر سے مسجد پڑھنے کیلئے جاتا۔ خواب میں دیکھتا کہ وہ اپنا سر ماں کی گود میں رکھ کر آنکھیں بند کرلیتا۔ مگر جب آنکھ کھولتا تو اُس کی ماں نہیں ہوتی۔ اُس کا سر ایک پتھر پر ہوتا جہاں انسان کی بُو تک نہ ہوتی۔ چھپکلی، گرگٹ، سانپ وغیرہ اپنے بل سے نکل کر دوسرے بل میں گھستے۔ عبدالولی کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ انسانوں سے علیحدہ ہوچکا ہو۔ گرچہ ماں کی خوشبو اب بھی وہ محسوس کرتا مگر ماں موجود نہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہوتی۔ ڈر کے مارے کھڑا ہو جاتا۔ ادھر اُدھر دیکھتا سوائے سانپ، گرگٹ اور چھپکلی کے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ پھر رونے لگتا اور روتے روتے جاگ جاتا۔ اور بھی اسی طرح کے ڈراؤنے خواب دیکھتا۔ جس وقت اُس نے قرآن شریف حفظ کر لیا یہ خواب کم دیکھنے لگا۔ مگر دوسرا خواب زیادہ دیکھتا۔ آج بھی جب وہ سویا تو یہی خواب دیکھا۔

خواب میں دیکھ رہا تھا کہ اُس کے سینے میں روشنی ہے، ارد گرد اندھیرا ہے، کچھ بچے اس روشنی میں بیٹھے پڑھ رہے ہیں، ایسی چیز جیسے سانپ مگر اُس کا سر بہت بڑا ہوتا ہے اِس کی طرف آرہا ہوتا ہے۔ ایک بچے کو مُنہ میں اٹھا کر نِگل لیتا ہے۔ اس کے قریب بیٹھے بچوں کے نزدیک آتا ہے۔ جب اس کے سینے کی روشنی پر نظر پڑتی ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ پھر نزدیک آجاتا ہے اور اپنا بڑا سا مُنہ کھول لیتا ہے۔ مُنہ کھولتے ہی اُس کے بڑے پیلے آدھے خون زدہ دانت نظر آجاتے ہیں۔ عبدالولی ڈر کے مارے چیخ اُٹھتا ہے اور اسی چیخ پر جاگ جاتا۔

مگر آج خواب میں یہ اژدھا نما سانپ اسی کے ساتھ بیٹھے ایک بچے کو نِگل لیتا ہے، پھر دوسرے بچے کو۔ باقی بچے کتاب پھینک دیتے ہیں اور بھاگ کر اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اژدھا نما سانپ جب اس کے سینے کی روشنی کو دیکھ لیتا ہے تو اپنا بڑا مُنہ کھول لیتا ہے۔ عبدالولی ایک دم نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ جب اُس کی آنکھ کھل جاتی ہے تو فجر کی آذان ہو رہی ہوتی ہے اور آذان کے یہ الفاظ اُس کے کان کو چھونے لگتے ہیں۔ (اَلصَلوٰةُ خَیرٌ مِّنَ نَوم)۔

وضو کیا، نماز پڑھی، چائے کے ساتھ سوکھی روٹی کھالی، اسی اثناء " امر بی المعاروف و نهي عن المنكر " کی گاڑی آگئی۔ ڈرائیور نے کہا

ضلعی امیر نے کہا ہے کہ تم نئے اوطاق پر سامان سمیت جاؤ۔ دس ایسے بندوں کو اس کام میں اپنے ساتھ لے چلو جو تمھاری مدد کر سکیں۔ اور دوسری بات جو نئے طالبان آئے ہیں اُن کی طرف ایک مرتبہ چکر لگالو۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

عبدالولی نے بھی دس آدمی اپنے ساتھ تیار کر لیے اللہ داد کو اپنا نائب مقرر کیا، ایک گاڑی میں ساتھیوں کو سامان سمیت نئے اوطاق پر جانے کو کہا۔ وہ خود نئے طالبان کے اوطاق پر گیا، اوطاق کے امیر نے اچھی خاطر تواضع کی۔ پھر اُن کو طالبان سے متعارف کروایا اور طالبان کو اِن سے متعارف کروایا۔ تعارف کے بعد عبدالولی نے طالبان کے سامنے یوں تقریر شروع کی۔

میرے عزیز بھائیو اور شیدایانِ دین مسلمانوں! آپ لوگوں کا اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ لوگ دین مبین سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص دین کیلئے جانی قربانی دینے کیلئے تیار ہوتا ہے اس کی دین کے ساتھ محبت پر شک کرنا (نعوذ باللہ) خدا کی خدائی پر شک کرنا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ لوگ سب کچھ چھوڑ کر یہاں آئے ہیں، ایک خاص مقصد کیلئے۔ وہ خاص مقصد دین اسلام کی سربلندی ہے۔ آپ لوگ مسجدوں یا پھر مدارس سے آئے ہونگے۔ وہاں آپ لوگوں کو دین و دنیا میں فرق واضح طور پر معلوم ہو گا۔ وہ لوگ یعنی ہمارے ماں باپ جنہوں نے ہمیں مدرسہ بھیجا اور ہمیں دینی درس اس لیے پڑھایا تا کہ ہم دین اسلام کے چراغ بن سکیں۔ یہ بات بالکل بجا ہے کہ ہم دین کے چراغ بنیں گے۔ مگر یہ لوگ دین کے چراغ بھیک سے جلاتے ہیں۔ ہمارے عوام اور عوام میں یہ لوگ جو خصوصاً عصری تعلیم کو زیور سمجھتے ہیں دین کا کام ہمارے گلے میں ڈالتے ہیں اور خود دنیا کے مزے لوٹتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ دین و دنیا دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ خود کیلئے دنیا کی تمام آسائش حاصل کرنے کیلئے سکول، کالج، اور اُس میں ہر چیز کی سہولت۔ اس کے بعد ہر جگہ نوکری انہی کی ہیں۔ حکومت چلانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ہر چیز پر اپنی اجارہ داری قائم کی ہے۔ یہ اپنے گھروں میں اپنی ماوؤں، بہنوں اور بیویوں کے ساتھ پیٹ بھر کھانا کھاتے ہیں اور دین کی ذمہ داری ہمیں سونپی ہے۔ ہمیں جو کہ کبھی بھی پیٹ بھر کر کھانا تک نہیں کھایا اور نہ ماں اور بہن کا پیار دیکھا ہے، گھر ہمارا حجرہ ہے اور خوراک ہماری دال اور آلو۔ اس کے باوجود ان کی قہر زدہ نظر ہم پر ہوتی ہے۔ ایسا جیسے کہ ہم اِن میں سے نہیں کہیں اور سے آئے ہیں۔ کوئی دوسری مخلوق ہیں۔ ایسی مخلوق جس کا نہ تو پیٹ ہے اور نہ ہی نفس۔ آج وہ دن

(c) ketabton.com: The Digital Library

آ گیاہے جس میں ہم اُنہیں بتائیں گے کہ ہم اپنے سر کے بدلے نظامِ حکومت اُن سے اچھی طرح چلاسکتے ہیں۔ اور یہ نظام ہم اپنی خوشی کیلئے نہیں بلکہ دین اسلام کی سربلندی کیلئے چلائینگے۔ اور ہر اُس چیز کو اُکھاڑ پھینکیں گے جو دین اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے۔ اس دنیا کی خوشیاں نہ ہماری ہیں اور نہ رہیں گی۔ اس دنیا کی زندگی فانی ہے۔ تو چاہیئے کہ اس فانی زندگی کو ابدی زندگی پر قربان کردیں۔ ہماری یہ قربانی اسلام کی سربلندی کا باعث بن جائے گی۔ اللہ ہماری یہ قربانی اپنے در پہ قبول فرمائے۔ آمین

نعرہ تکبیر! اللہ اکبر

طالبان نے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔

عبدالولی نے اس تقریر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ طالبان کے ساتھ گزارا، پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے نئے اوطاق پر چلا گیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۱۰)

اگرچہ ضلع میں پہلے بھی امن و امان کی صورتحال اچھی تھی۔ چوری، لوُٹ مار بہت کم تھی مگر عبدالولی کے آنے سے یہ چیز بالکل ختم ہوگئی۔ عبدالولی کا دبدبہ تمام لوگوں پر طاری تھا۔ عبدالولی عوام الناس میں حافظ کے نام سے مشہور تھا۔ اب علاقے میں کسی کو جرات تک نہیں تھی کہ وہ کسی بُرے کام کا سوچ بھی سکے۔ اس لیے کہ حافظ صاحب لوگوں کے ذہنوں پر قابض تھا۔ حمام تو پہلے سے ہی بہت کم تھے، اب تو بالکل ختم ہو گئے تھے۔ جو تھے وہ صرف نہانے اور یا پھر بال بنوانے کیلئے تھے۔ اگر سونا بھی چلتی راہ میں رکھتے تو کسی کی مجال نہ ہوتی کہ اُسے ہاتھ تک لگائے۔ نماز کے وقت بہت سی ایسی دکانیں تھیں جو کھلی رہتیں۔ دکاندار ضرور نماز باجماعت ادا کرتے۔ کھلی دکان کی طرف کسی کو آنکھ اُٹھانے کی جرات نہ تھی۔ عورتوں پر ایسا رعب دبدبہ تھا کہ وہ کسی قیمت پر گھر سے نہیں نکلتیں۔ یہ رعب اور دبدبہ اُس دن اور بڑھ گیا جس دن عبدالولی اپنی گاڑی میں گشت پر نکلا تھا۔ اللہ داد بھی اُس کے ساتھ تھا۔ چار عورتوں کو دیکھا جو بازار میں پھر رہیں تھیں۔ اُس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور ایک طالب سے کہا۔

جاؤ اُس دکاندار سے پوچھو کہ ان عورتوں کو کیوں دکان میں کھڑا کیا ہے۔

طالب گیا دکاندار سے عورتوں کے بارے میں پوچھا، دکاندار نے جب عبدالولی کو دیکھا تو اُس کے پاس آیا۔

السلام علیکم

حافظ صاحب! یہ عورتیں سودا لینے کیلئے آئی ہیں۔ سودا خرید رہی ہیں۔

کیوں گھر میں کوئی اور نہیں جو یہ خود سودا لینے آئی ہیں۔ عبدالولی نے پوچھا۔

حافظ صاحب ! اور تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ گھر میں ہو گا کہ نہیں۔ میں تو صرف۔۔۔۔۔

جاؤ، جاؤ عورتوں کو میرے پاس بھیجو۔ عبدالولی نے دکاندار کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

دکاندار بھاگ کر اپنی دکان کی طرف گیا اور عورتوں کو عبدالولی کی طرف بھیج دیا۔
عورتوں نے جب حافظ صاحب کا نام سنا تو کانپنے لگیں، اس لیے کہ انہوں نے حافظ صاحب کے بارے میں سنا تھا۔ ڈرتے ڈرتے عبدالولی کے پاس آئیں۔

تم لوگ کس لیے بازار آئی ہو؟ تم لوگوں کو پتہ نہیں کہ عورتوں کا گھر سے نکلنا ممنوع ہے۔ عبدالولی نے غصے سے کہا۔

بیٹا کیا کریں، گھر میں اتنا کوئی نہیں کہ سودا لا سکے۔ ایک بوڑھی عورت جس نے برقعہ میں اپنے آپ کو ڈھانپا تھا نے کہا۔

کیوں؟ کونسی بلا کھا گئی جو کوئی نہیں ہے۔ عبدالولی نے پوچھا۔

اس ملک کو جس بلا نے کھایا ہے اُس نے۔ بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

ملک کو کس بلا نے کھایا ہے؟ عبدالولی کو بوڑھی عورت کا جواب ناخوش گوار گزرا۔ اسی لیے کچھ اور اونچی آواز میں کہا۔

تین بقیہ عورتیں ڈرتی ہوئی ایک دوسرے کے قریب ہو رہی تھیں۔

جنگ کی بلا نے کھالیا ہے۔ پچھلے تیس سالوں سے یہ بلا اس ملک پر مسلط ہے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا تو کسی کا خاوند۔ ایسا گھر نہیں ہو گا جسے اس بلا نے نہ کھایا ہو۔ ہر گھر سے جنازے نکلے ہیں۔ بوڑھی عورت نے تحمل سے جواب دیا۔

اب تو جنگ نہیں ہے پھر تمھیں تو چاہیئے کہ اکیلی آتی۔ ان تینوں کو کیوں ساتھ میں لائی ہو۔ عبدالولی نے دوسری عورتوں کی طرف دیکھا۔

ایک میری بہو ہے، دوسری میری ہمسائی ہے ان کے بھی گھر میں کوئی نہیں۔ بوڑھی عورت نے کہا۔

عبدالولی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ان عورتوں میں سے ایک کے ہاتھ سے سامان کی گٹھڑی گر گئی۔ جب وہ سامان کیلئے جھکی تو اُس کے ہاتھ نظر آئے جس پر مہندی لگی ہوئی تھی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اچھا تو تمھارے گھروں میں کوئی نہیں، ہاں۔ ہاتھ تو مہندی سے ایسے سرخ کیے ہیں جیسے دلہنیں۔ یہ ہاتھ کس کے لیے سرخ کیے ہیں۔ کچھ دُرے لگاؤ ان کو کہ پھر بازار کا نام بھی نہ لیں۔ یہ تو خود آئی کہ آئی اپنے ساتھ جوان بہو کو بھی ہاتھوں میں مہندی لگی ساتھ لائی ہے۔ عبدالولی نے ایک طالب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

بیٹا میری بات سنو۔ بوڑھی عورت کچھ کہنے والی تھی کہ طالب نے عورتوں کو دُرے مارنا شروع کیے۔ عورتیں چیخنے لگیں۔ سارا بازار انہیں دیکھ رہا تھا مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ انہیں اس کام سے روکیں۔

اللہ داد جلدی سے گاڑی سے اُترا اور طالب سے کہا۔ بس کرو، کیا کر رہے ہو، جیسا کہ تم نے اسے زناکاری میں پکڑا ہے۔ بوڑھی جو زمین پر گر گئی تھی اُسے اُٹھالیا۔

جاؤ اماں! آئندہ خیال رکھنا۔ اللہ داد نے اُس سے کہا۔

خدا تم لوگوں کو غرق کرے۔ ایسی مسلمانی پر خدا تم لوگوں کی بادشاہت ختم کرے۔ بوڑھی عورت بد دعائیں دینے لگی۔

عبدالولی نے غصے سے گاڑی کا دروازہ کھولا تو اللہ داد نے جلدی سے واپس بند کر دیا۔

تم بیٹھے رہو اور گاڑی سے مت اُترو۔ اللہ داد نے عبدالولی سے کہا۔

پھر عورتوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پھر عبدالولی سے کہا۔

یہ تم نے کیا کیا، ان عورتوں کا ایسا کونسا گناہ تھا جو سر بازار بے عزت کیا۔

یہ کیا کم گناہ ہے کہ وہ بازار آئی ہیں۔ پھر اکیلی بھی نہیں اپنے ساتھ جوان سرخ ہاتھوں والی آئی ہے۔ تم نے اُس کی بد دعائیں نہیں سنیں؟ عبدالولی نے غصے سے کہا۔

عبدالولی اخوند! تم غصہ مت ہو۔ تمھارے خیال میں یہ عورتیں سودا کی بجائے دوسرے کام کے سلسلے میں آئیں تھیں۔ اللہ داد نے عبدالولی سے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

جس چیز کیلئے آئیں ہیں بازار آنا ان کیلئے جائز نہیں۔ عورت گھر میں رہے گی، گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ عبد الولی نے کہا۔

اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا یا پھر ہم نہیں دیتے؟ اسلام کا نام بدنام مت کرو۔ اسلام کے نام پر اپنی مرضی مت چلاؤ۔ تم کی ان کی ضروریات سے کہاں واقف ہو کہ کس ضرورت کے تحت وہ باہر نکلی ہیں، ان کے گھروں کے حالات تمھیں معلوم ہیں کہ نہیں۔ اللہ داد نے جذباتی ہو کر کہا۔

تمھیں ان کے حالات کا پتہ ہے کہ ان بے کسوں پر کیا گزری ہے مجھ سے پوچھو۔

مجھے ان کے گھروں سے کیا کام۔ عبد الولی نے کہا۔

جب گھروں کے حالات کی پرواہ نہیں تو پھر ان کے کاموں کی کیوں؟ اللہ داد اُسی طرح جذباتی تھا۔

یہ میری ڈیوٹی ہے کہ ان کو بُرے کاموں سے روکوں۔ عبد الولی نے اللہ داد کی باتوں کو بغیر توجہ دیے کہا۔

انہوں نے ایسا کونسا بُرا کام کیا ہے، ماحول کی خرابی کا باعث بنا ہے، یا پھر بازار میں فحاشی پھیلا رکھی ہے۔ پاؤں کے ناخن تک انہوں نے اپنے آپ کو ڈھانپ رکھا ہے۔ اللہ داد نے کہا۔

اللہ داد اخوند! تم تو جذباتی ہو گئے۔ یہ ڈنڈے کے مسلمان ہیں، یہ جب ڈنڈا دیکھتے ہیں تو پھر صحیح ہوتے ہیں۔ ورنہ یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ عبد الولی نے اللہ داد کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

یہی تو ہماری بدقسمتی ہے۔ اس عوام کی بدقسمتی ہے۔ جسے ہر کوئی ڈنڈے سے ہانکنا چاہتا ہے۔ انہیں حیوان سمجھتے ہیں اگر حیوان کے ساتھ بھی پیار سے پیش آیا جائے تو اس کا جواب بھی پیار ہوتا ہے۔ ہم تو پھر بھی انسان ہیں۔ دل کی بجائے ہم سروں پر بادشاہت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ داد نے چند فقروں میں اپنے ملک اور عوام کی کیفیت بیان کر دی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

بجائے اس کے کہ ہم ان لوگوں کی ضروریات زندگی کو پورا کریں، ہم انہیں ڈنڈوں سے خوف زدہ کر رہے ہیں اور خوف کے تابع بنا رہے ہیں۔ اللہ داد نے اپنی بات پوری کی۔

تم چلو خدا خیر کرے گا۔ عبدالولی نے کہا۔

اس واقع کے بعد عورتیں مر جاتیں مگر بازار نہیں آتیں۔ تمام علاقے کی عورتیں ایسی تھیں جیسے کہ قید خانے میں ہوں۔ ایسا نہ تھا کہ اس سے پہلے عورتیں بازار میں نہیں پھرتیں یا پھر بغیر مُنہ چھپائے پھرتیں، عورتیں اگر نکلتی بھی تو برقعہ اوڑھتیں یا بڑی چادر نماز اوڑھتیں۔ جس سے ان کا پورا جسم ڈھکا ہوتا۔ شہر کے لوگ ایسے تھے جیسے وہ اپنی مرضی کی زندگی نہیں گزار رہے بلکہ زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ نہ کوئی کھلے دل خوشی منا سکتا تھا نہ غم۔ عبدالولی کا خوف پورے علاقے میں پھیل چکا تھا۔ عبدالولی کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ پتھر سے بنا ہے۔ نہ اُس کے سینے میں دل ہے اور نہ ہی رحم۔ ضلعی پولیس میں جس کسی نے جرم کیا ہوتا اور وہ نہیں مانتا تو حافظ صاحب کے نام نسخہ آزمایا جاتا۔ تمام علاقے سے جرم ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ عبدالولی کو یہ تمام باتیں ذہنی سکون مہیا کرتیں۔ کسی کو تکلیف دینا اُس کے ذہنی سکون کا حصہ بن چکا تھا۔ اس عمل پر وہ فخر محسوس کرتا۔ ظلم اور انصاف کے درمیان فرق کرنا اس رویے نے ختم کر دیا تھا۔ مگر جب اکیلا ہوتا تو دل بے چین ہو جاتا جیسے اُس کی کوئی خاص چیز کھو گئی ہو۔ ایک ایسی چیز جسے اُس کی طلب ہو۔ مگر وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا چیز ہے جسے اُس کی طلب ہے۔ اندر ایک خلا جیسا تھا۔ عبدالولی نے کبھی بھی کسی کو اپنے دل کا حال نہیں بتایا تھا۔ اس لیے اُس کے دل کے قریب کوئی تھا ہی نہیں۔ ایک اللہ داد اُس کا ایسا دوست تھا جس سے اُس نے تھوڑا بہت دل کا حال کہا تھا۔ مگر اللہ داد کو بھی اس کے دل کے اِس حال کی کوئی خبر نہ تھی۔ کیسے پتہ چلتا، عبدالولی کو خود شعوری طور پر اس چیز کا ادراک نہ تھا۔ عبدالولی پر جب بھی بے سکونی کا دورہ پڑتا تو وہ اکیلا اپنے کمرے میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتا۔ یا پھر شہر کے قریب اُس آبشار پر جاتا جہاں پانی بڑی تیزی سے اُوپر سے نیچے کی طرف آتا۔ اس پانی کا شور بہت زیادہ تھا۔ چھینٹے نزدیک

(c) ketabton.com: The Digital Library

تک گرتے۔ عبد الولی اس پانی کے اتنے قریب بیٹھ جاتا کہ اُس کے چھینٹے عبد الولی کو بھگو دیتے۔ ایسا لگتا جیسے اس پانی کے ذریعے وہ اپنے اندر کی بے سکونی کی آگ کو بُجھانا چاہتا ہو۔ وہ آگ جو بچپن میں محرومی کی وجہ سے معاشرے نے اُس کے اندر لگائی تھی۔ عبد الولی اُس وقت اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا۔ چھوٹی بہن گل پانڑا تو اُس کے جگر کا ٹکڑا تھی۔ اُس محبت سے وہ اُس وقت محروم ہوا اور یہ محبت ادھوری رہ گئی۔ جب وہ گھر سے مسجد پڑھنے کیلئے نکلا، مہینے کے بعد جب وہ جمعرات کو گھر آتا تو گل پانڑا کو اُس وقت تک گود میں اُٹھائے رکھتا جب تک وہ واپس نہ چلا جاتا۔ یا پھر ماں کی گود میں سر رکھتا۔ ماں کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرتا، ماں اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی۔ اسے یہ بہت اچھا لگتا جب اُس کی ماں اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی۔ اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ مسجد میں زیادہ دن گزارے۔ پڑھنے کو بہت دل چاہتا مگر ماں کے بغیر اور ماں سے دور دن گزارنا اس کیلئے مشکل تھا۔ جمعہ کی شب یا پھر ہفتہ کے دن جب وہ گھر سے نکلتا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگتے۔ ماں بھی جب اُس کا ماتھا چومتی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ پھر عبد الولی سے چھپا کر اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھ لیتی اور اُسے کہتی

جا بیٹا! اللہ تمھارا حامی و ناصر ہو۔

یہ بات وہ اتنا بے بس ہو کر کہتی جیسے اُس سے اُس کا بیٹا زبردستی چھینا جا رہا ہو اور وہ اُسے نہیں روک سکتی۔

اُس دن جب وہ آخری بار اپنے گھر سے نکل رہا تھا تو گل پانڑا کا اُس کو دامن سے پکڑنا اسی طرح یاد تھا جیسے آج بھی اُس نے اسے دامن سے پکڑا ہو۔ ماں کی بے بسی کے آنسو آج بھی اُس کے دل پر چھُریاں چلا رہے تھے۔ وقت کے دیے ہوئے ان زخموں نے عبد الولی کے وجود اور شخصیت کے بیچ ایسی خلا بنائی تھی جس کی وجہ سے اُس کی زندگی پر ایک خوف کا سایہ پھیل گیا تھا۔ عبد الولی کی شخصیت ایک عام شخصیت نہ تھی۔ اسی لیے وہ لاشعوری طور پر اپنی محرومیوں کا بدلا اس معاشرے اور عوام سے لے رہا تھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۱۱)

آج خال دارہ کو عبدالولی بہت یاد آرہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جیسے کسی نے آنسوؤں کی تمام راہیں کھول دیں ہوں۔ احمد خان جس نے اب گھر کی ذمہ داری سنبھال لی تھی عبدالولی کے جانے کے بعد زندگی کو گزارنے کیلیئے بھرپور کاندھا دیا تھا۔ اگرچہ وہ عبدالولی سے ایک سال چھوٹا تھا مگر اُس کی جسمانی ساخت ایسی بن گئی تھی کہ وہ عبدالولی کا ہم عمر لگ رہا تھا۔ مشقت نے احمد خان کے چہرے سے جوانی کی شگفتگی مٹادی تھی۔ گھر کی تمام ضروریات بڑی ذمہ داری کے ساتھ پوری کرتا۔ ماں اور بہنوں کا بہت خیال رکھ رہا تھا۔ ایک بہن کو بیاہ چکا تھا۔ اور دوسرے بھائی کی شادی کرا چکا تھا۔

ماں کو جب روتے ہوئے دیکھا تو اُس کے پاس آیا۔

ماں! کیوں رو رہی ہو؟ کیا ہوا ہے؟

رونا تو اب میری قسمت میں لکھا ہے۔ ماں نے جواب دیا۔

کیوں ہم آپ کے بیٹے نہیں؟ ہم نے آپ کی بات نہیں مانی؟ تینوں آپ کی خدمت میں ایسے کھڑے ہیں جیسے نوکر۔ احمد خان نے ماں کے آنسوؤں میں عبدالولی کی تصویر دیکھ لی۔ اس لیے یہ سب کہا۔

خدا تم لوگوں کو سدا آباد رکھے۔ میں اس لیے نہیں رو رہی کہ میری خدمت نہیں ہو رہی۔ دونوں بہوئیں میری بہت خیال رکھ رہی ہیں۔ مگر بیٹا۔۔۔۔۔۔ خالدارہ کی آواز وہیں اُس کے گلے میں رُک گئی جیسے کسی نے اُس کا راستہ روکا ہو۔

میں سمجھتا ہوں ماں! مگر کیا کروں، میرے بس میں نہیں۔ احمد خان نے اپنی بات پوری نہ کی۔

ہاں بیٹا! اس لیے تو خدا کے سامنے رو رہی ہوں کہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ افسوس اس بات کا بھی ہے کہ وہ کتنا ظالم ہے، ایسا گیا جیسے کسی اور کا بیٹا ہو۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہے وہ پرایہ بیٹا۔ اگر وہ پرایہ نہ ہوتا تو کم از کم اتنے سالوں میں ایک بار تو آتا۔ یا پھر اپنا کوئی احوال بھیجتا۔ ہم نہ سہی، آپ کے لیے تو کرتا۔ احمد خان نے غصے سے کہا۔

نو مہینے کوکھ میں پالا ہے۔ اپنی رگوں کا خون دیا ہے اُسے۔ وہ اتنا ظالم نہیں ہو سکتا بیٹا۔ طالب ضرور کسی مصیبت میں ہے۔ خال دارہ نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں احمد خان کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

بس ماں بس۔ اس گھر میں جب بھی خوشی آئی ہے طالب کی یادوں نے اُسے ماتم میں تبدیل کر دیا ہے۔ اماں جان میں نے تو کبھی آپ کی آنکھوں میں خوشی کی روشنی نہیں دیکھی۔ میری شادی میں، جانان کی شادی میں۔ ہماری دلہنوں کو آپ نے اس گھر میں آنسوؤں کے ساتھ داخل کیا۔ خوشی کے گیتوں کی بجائے غم کا ماتم کیا۔ غم کے مرثیے گائے۔ خدا کیلئے گل پانڑا کی شادی میں آپ نہ روئیں۔ گل پانڑا کی شادی کی خوشی میں ہم سب خوش ہیں۔ یہ ہماری چھوٹی بہن ہے۔ اس نے بھی اُس بھائی کیلئے آنسو بہائے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ خوشی خوشی اس گھر سے رخصت ہو۔ احمد خان نے ماں کی مِنت کی۔

بیٹا! یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں تو نہیں روتی، میرا دل روتا ہے۔ گل پانڑا کی شادی میں اس لیے زیادہ رونا آرہا ہے کہ گل پانڑا کو طالب اپنے کاندھوں اور گود میں گھماتا تھا۔ جیسے ہی وہ رونے لگتی اُسے گود میں اُٹھالیتا، گل پانڑا بھی فوراً چُپ ہو جاتی جیسے دودھ کی بوتل بچے کے مُنہ میں دی جاتی ہے۔ اگر اب وہ رونے لگی تو کون اُسے چُپ کرائے گا۔ اب تو میرا طالب بیٹا بھی نہیں کہ اُسے گلے سے لگالے۔ بہنوں کی مانگ • تو بڑے بھائی نکالتے ہیں اور گل پانڑا کا بڑا بھائی تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خال دارہ بات کرتے کرتے رونے لگی۔

احمد خان نے اپنی ماں کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

• مانگ: پشتونوں کی شادیوں میں یہ رواج عام ہے کہ بڑا بھائی اپنی بہن کے سر کے بالوں میں مانگ نکالتا ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

کیوں ماں! کیا میں اُس کا بڑا بھائی نہیں، کیا یہ دوسرے اُس کے بھائی نہیں۔ اگر طالب نہ ہوا تو کیا گل پانڑا کی مانگ نہیں نکلے گی؟ مریم کی مانگ بھی تو میں نے نکالی تھی۔ احمد خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

گل پانڑا کی بات اور ہے۔ گل پانڑا کو میں نے دیکھا ہے جب بھی وہ اپنے بستر پر لیٹتی ہے تو پہلے اپنے آنسوؤں سے تکیہ گیلا کر لیتی ہے۔ جب سے اُس نے اپنے جہیز کیلئے کشیدہ کاری شروع کی ہے تب سے ایک ایک کمر بند طالب کیلئے بنا رہی ہے۔ اب تک دس کمر بند بنا چکی ہے۔ ماں نے جواب دیا۔

عبدالولی پورے گھر کے لیے ایک زخم جیسا تھا۔ مگر ماں کیلئے یہ زخم ناسور بن چکا تھا جس کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔ ہر خوشی کے موقع پر یہ زخم پھر سے پھوٹ پڑتے۔ تمام گھر کو خوشی کی بجائے غم کا سامنا کرنا پڑتا۔ جب عبدالولی اپنے گھر سے روانہ ہو رہا تھا تو اُس وقت گل پانڑا لگ بھگ چار برس کی تھی۔ اپنے چھوٹے سے ذہن کے مطابق ماں کی باتوں نے پورا پورا رنگ بھرا تھا۔ جس سے ایک جوان عبدالولی بن چکا تھا۔ گل پانڑا کو یہ بات اور بھی ٹھیس پہنچاتی کہ عبدالولی گل پانڑا سے بہت پیار کرتا تھا۔ گل پانڑا نے اپنے ذہن کے کینوس پر عبدالولی ایک تصویر بنا رکھی تھی۔ اگرچہ گل پانڑا سے دوسرے بھائی بھی بہت پیار کرتے تھے مگر عبدالولی کے بچپن کا پیار کسی نے حاصل نہ کیا۔

گل پانڑا کی شادی کی تیاریاں جاری تھی۔ بھائیوں نے اپنی بہن کی خوشی کیلئے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مگر ایک ایسی خوشی تھی جو اُن کے بس میں نہ تھی۔ اور وہ تھی عبدالولی کا پیار۔

شادی کے دن جب ہمجولیوں نے اُس کے ہاتھوں پر مہندی لگائی، سر پر سبز رنگ کا دوپٹہ ڈالا اور بال بنانے کیلئے گاؤں کی ایک بوڑھی عورت بھی آئی تھی۔ گل پانڑا کے بال بنانے کیلئے سر سے دوپٹہ اُتارا گیا اور مریم سے کہا

دلہن کے بڑے بھائی کو بُلاؤ تاکہ دلہن کے سر کی مانگ نکالے۔ بیچ میں راستہ نکالے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

بوڑھی عورت کی یہ بات گل پانڑا پر ایسے گری جیسے بجلی۔ گل پانڑا چیخ اُٹھی جیسے جنات نے آ گھیرا ہو۔

ہائے طالب۔۔۔۔ ہائے طالب۔۔۔ میرا پیارا لالا کہاں ہے۔ گل پانڑا نے بوڑھی عورت کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ میرے پیارے لالا کو بُلا لاؤ، آج اُس کی بہن گھر سے جارہی ہے۔۔۔ ہائے لالا۔۔۔۔۔ ہائے لالا۔۔۔۔۔ آپ کدھر ہو۔۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔۔۔ میری مانگ کون نکالے گا۔۔۔۔۔ طالب لالا تو نہیں۔۔۔۔۔ گل پانڑا زارو قطار رونے لگی۔ سہلیاں اور گاؤں سے آئی ہوئی عورتیں بوکھلا گئیں۔ جیسے وہاں کسی نے سانپ چھوڑ دیا ہو۔ سر کے بال بناتے وقت ہر دلہن روتی ہے مگر گل پانڑا کا رونا کچھ اور تھا۔ ایک بہن کے ارمانوں کا رونا۔ شاید اس رونے کو گل پانڑا نے اپنے دل میں کئی برسوں سے جگہ دی ہو۔ لیکن آج، آج وہ بند ٹوٹ گئے۔ رونا اُس کے دل سے ہو کر زبان پر آ گیا۔ اسی لیے بیٹھی عورتیں بوکھلا گئیں کہ کیا کریں۔ اسی اثناء احمد خان کسی کام سے گھر کے صحن میں آیا تھا، اُس نے گل پانڑا کو گلے سے لگایا۔

مت رو، کیوں رو رہی ہو، جس بہن کے جوان بھائی ہوں کیا وہ ایسے روتی ہیں؟

ہائے لالا۔۔۔۔ طالب لالا نہیں ہے۔۔۔۔ میری مانگ کون نکالے گا۔۔۔۔۔ مجھے گلے سے کون لگائے گا۔۔۔ کون مجھے اُٹھائے گا۔۔۔۔۔ گل پانڑا اُسی طرح زارو قطار رو رہی تھی۔

تمھاری مانگ میں نکالوں گا۔۔۔ تمھارا بھائی۔۔۔۔ میں تمھیں اُٹھاؤنگا۔۔۔۔ تم کیوں رو رہی ہو۔۔۔۔ کیا ہوا جو طالب نہیں ہے۔۔۔۔۔ دوسرے تو ہیں۔ بس کرو۔ بس کرو۔ لالا تمھارا ہر ارمان پورا کرے گا۔ احمد خان کی آواز بیٹھ گئی۔

صحن میں بیٹھی تمام عورتوں کے آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ گھر میں ایسا ماحول بن گیا جیسے گل پانڑا کی ڈولی کی بجائے عبدالولی کا جنازہ اُٹھایا جارہا ہو۔ ماں تو ایک زندہ لاش بن چکی تھی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۱۲)

آج صبح سے عبد الولی بے سکون تھا جیسے اُس کی کوئی چیز کھو گئی ہو۔ صبح ناشتہ بھی نہیں کیا۔ اوطاق میں جب دوسرے طالبان نے ناشتہ کیا تو ایک طالب عبد الولی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

حافظ صاحب! گاڑی گشت کیلئے تیار ہے۔

عبد الولی کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ گشت پر نکلے۔ اُس نے طالب سے کہا

ایسا کرو کہ اللہ داد اخوند سے کہو کہ آج گشت کر لے۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔

طالب بھی باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد اللہ داد عبد الولی کے کمرے میں داخل ہوا

السلام علیکم!

وعلیکم سلام! عبد الولی نے جواب دیا۔

خیر تو ہے آج گشت پر کیوں نہیں نکل رہے۔ اللہ داد نے عبد الولی سے پوچھا۔

اللہ داد اخوند! پتہ نہیں کیوں آج طبیعت میں بے سکونی زیادہ ہے۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

کیوں رات کے آلو کے شوربے نے تو اثر نہیں کیا۔ اللہ داد نے مذاق میں کہا۔

اللہ داد اخوند! ہمارے پیٹ اس کے عادی ہیں۔ عبد الولی نے مسکرا کر کہا۔

ہمارے پیٹ اس سے خراب نہیں ہوتے ہاں اگر مرغن کھانا کھایا ہو تو شاید خراب ہو جاتے ہیں۔ ہماری قسمت میں نہ کل اچھا کھانا تھا اور نہ آج۔ سب کچھ ہمارے ہاتھوں میں ہونے کے باوجود۔ عبد الولی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

شہر میں ہر چیز ہے، تمھارا ہاتھ کس نے روکا ہے۔ ہر دکاندار اس بات پر خوش ہو گا کہ وہ تمھاری خدمت کرے۔ اللہ داد نے کہا۔

کچھ تو اپنی داڑھی کی شرم کرو۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ دنیا کیا کہے گی۔ بہت اچھا لگو نگا جو دکانداروں سے مفت چیزیں لو نگا۔ یہ خدا کو پسند ہو گا۔ عبد الولی نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

خدا تو بہت سی چیزوں کو ناپسند کرتا ہے مگر وہ ہم کرتے ہیں۔ پھر دنیا کے بارے میں مجھے اور تمھیں کیا فکر۔ ہم نے کبھی دنیا کے بارے سوچا ہے۔ دنیا تو ویسے بھی ہم پر غصہ ہے۔ اللہ داد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

اللہ داد اخوند! تم مست ہو۔ تم جاؤ میں آج بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تم ابھی جا کر گشت کرو میں پھر سہ پہر کو تمھارے ساتھ گشت پر نکلتا ہوں۔ اور ہاں خیال کرنا ایسا کوئی کام نہ کرنا جس کا میں پھر جواب نہ دے سکوں۔ پچھلی بار بھی تم نے گاڑی میں ٹیپ لگایا تھا۔ عبد الولی نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

حافظ صاحب! قربان جاؤں آپ لوگوں کے نظام سے۔ لوگوں کے ساتھ ساتھ ہم پر بھی مزے کی ہر چیز پر پابندی لگائی ہے۔ میرے دل کو تو زنگ لگ چکا ہے۔ اللہ داد نے جاتے جاتے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

مزہ۔ عبد الولی خود سے ہمکلام ہوا۔ مزہ، میرا بس چلے تو اس مزہ لفظ کو کتاب سے نکال دوں۔ جس کسی نے ہماری زندگی سے مزے چھین لیے ہیں انہیں زندگی سے مزے نہیں دوں گا۔

عبد الولی نے ٹیک ایک طرف لگاتے ہوئے کہا۔

پھر واپس اُٹھ بیٹھا، ارد گرد کمرے میں نظر دوڑائی، پھر اُٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا، طالبان کے کاندھوں پر لٹکی کلاشنکوفوں کو دیکھا جو گشت کی گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔ پھر ایک چھوٹے طالب پر نظر پڑی جو برتن دھو رہا تھا۔

یہ ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ آہستہ سے خود کلامی کی۔ جلدی سے وہ کھڑکی سے ایک طرف ہو کر نیچے بچھے ہوئے گدیلے پر آ گرا جیسے کسی نے اُسے دھکا دیا ہو۔ اپنا بچپن اُسے یاد آیا۔ بچپن کے ساتھ ساتھ اپنا گھر یاد آیا۔ ماں نظروں کے سامنے آ گئی۔ ایسے نظر آئی جیسے وہ بہت غمگین ہو۔ دونوں ہاتھ کھول کر اُسے اپنے طرف بُلا رہی ہو۔ عبد الولی نے اپنی آنکھیں بند کیں۔ بہت عرصے کے بعد وہ یادوں کی گود میں گھِر گیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

طالب بیٹا! آج میں نے تمھارے لیے شوربہ بنایا ہے۔ بہت دن ہوئے تھے کہ ہم نے بھی گوشت نہیں کھایا تھا۔ تمھارے ابا سے کہا کہ آج عبدالولی آرہا ہے تھورا گوشت ضرور لانا۔ پتہ نہیں وہ مدرسہ میں کچھ کھاتا بھی ہے یا نہیں۔ تمھیں تو شوربہ بہت پسند ہے۔ماں نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔

مدرسہ میں گوشت کہاں ہے۔ وہاں تو دال ہے یا پھر آلو۔ جب میں گاؤں میں وظیفے اکھٹے کرتا ہوں تو مجھے شوربہ کی خوشبو بہت اچھی لگتی۔ دل چاہتا ہے پوری دیگ چُرا لوں۔ عبدالولی نے اپنی ماں سے کہا۔

ہو۔ تم اب بھی وظیفے اکھٹے کرتے ہو؟ تم تو کہہ رہے تھے کہ مدرسہ میں وظیفے اکھٹے نہیں کیے جاتے۔ماں نے پوچھا۔

کیوں مدرسہ کے طالبان پھر کیا کھاتے ہیں؟ اسی وظیفوں پر تو گزارا ہے اُن کا۔ یہ کونسے بڑے مدارس ہیں جو چندہ جمع کرتے ہیں۔ اپنے باورچی ہوتے ہیں جو اُن کیلئے کھانا بناتے ہیں۔

پھر تم لوگوں کیلئے کھانا کون پکاتا ہے؟ ماں نے پوچھا۔

طالبان خود پکاتے ہیں۔ ایک بار ایک طالب۔ دوسری بار دوسرا طالب۔ وہ مجھ سے تھوڑے بڑے ہیں۔ میرے جیسے چھوٹے طالبان صرف وظیفے (روٹی) اکھٹے کرتے ہیں اور بڑے سالن پکاتے ہیں۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

پھر تو یہ کیسا سالن ہو گا۔ ایک کھچڑی سی ہوتی ہو گی۔ماں نے کہا۔

آپ کیا سمجھیں بھنیں ہوئے ہونگے، پانی میں آلو ایسے ہوتے ہیں جیسے نہر میں پتھر۔ دونوں ہنس پڑے۔

ماں! میرا دل نہیں چاہتا کہ میں وہاں راتوں کو رہوں۔ مجھے گھر کی بہت یاد آتی ہے۔ آپ، گل پانڑا اور تمام بہت یاد آتے ہیں۔ میں اپنے گھر میں آپ کے قریب سونا چاہتا ہوں۔ میں وہاں بہت

(c) ketabton.com: The Digital Library

ڈرتا ہوں۔ حجرے میں ہم اتنی تنگ جگہ پر سوتے ہیں کہ کسی کا سر تو کسی کے پاؤں۔ گل پانڑا تو بہت یاد آتی ہے۔

گل پانڑا کے نام پر عبدالولی ایک دم چونک اُٹھا۔ یادوں کی دنیا سے حقیقت کی طرف آگیا۔ گل پانڑا اب بہت بڑی ہو گئی ہو گی۔ اب تو میں بھی اُسے نہیں پہچان سکوں گا۔ عبدالولی اپنی جگہ سے اُٹھا۔ چادر اپنے گرد لپیٹی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ صاف پانی کی ندی کی طرف روانہ ہوا۔ آج اُسے اپنا آپ تنہا تنہا سا محسوس ہو رہا تھا اور کچھ بے بس بھی۔

اللہ داد جب واپس گشت سے اپنی اوطاق پر آیا تو سیدھا عبدالولی کے کمرے میں چلا گیا مگر وہاں عبدالولی موجود نہ تھا۔ چھوٹے طالب سے جب عبدالولی کے بارے میں پوچھا تو اُس نے کہا۔

تھوڑی دیر ہوئی ہے کہ باہر چلا گیا۔

اللہ داد واپس گشت کی گاڑی میں بیٹھ کر اُسے سٹارٹ کیا، دوسرے طالبان نے جلدی جلدی کلاشنکوف اُٹھائے تو اللہ داد نے اُن سے کہا۔

تم لوگ یہی رکو، میں واپس آتا ہوں۔

اللہ داد کو معلوم تھا کہ عبدالولی کہاں ہو گا۔ سیدھا ندی کی اُس جگہ پر گیا جہاں پانی آبشار کی شکل میں گرتا تھا۔ عبدالولی پانی کے بہت قریب بیٹھا تھا جس سے اُس کے کپڑے گیلے ہو چکے تھے۔

اللہ داد نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور خود گاڑی سے اُتر کر عبدالولی کے قریب آکر اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ عبدالولی نے جلدی سے اُس کی طرف دیکھا۔ آنکھیں ایسی سُرخ تھیں جیسے مرچی ڈالی گئی ہو۔ اللہ داد نے جب اپنے دوست کی آنکھوں کو دیکھا تو اُس نے اپنے دل میں ایک درد سا محسوس کیا۔

عبدالولی اخوند! یہ کیا؟ تمھاری آنکھیں اتنی سُرخ کیوں ہیں۔ رو رہے تھے۔ اللہ داد نے حیرانی سے پوچھا۔

عبدالولی نے جلدی جلدی مُنہ پر پانی پھینکا اور آنکھوں کو دھو ڈالا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اللہ داد اخوند! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ عبد الولی نے ایسے انداز میں کہا کہ جیسے کسی نے اُس کی چوری پکڑی ہو۔

میں تو تمھارے پیچھے یہاں آیا ہوں۔ تم میری بات کا جواب دو کہ تمھاری آنکھیں اتنی سُرخ کیوں ہیں۔ اللہ داد نے اپنا سوال پھر دھرایا۔

کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی کچھ دُکھ رہی ہیں۔ عبد الولی نے اپنا چہرہ دوسری طرف کیا۔

جھوٹ مت بولو حافظ! تمھارے مُنہ سے جھوٹ اچھا نہیں لگتا۔ صبح تو ٹھیک تھیں اب کیا ہوا۔ کم از کم مجھ سے تو جھوٹ مت بولو۔ مجھے صبح ہی سے کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کچھ پریشان ہو۔ میں تمھارا درد سمجھتا ہوں، کتنی بار تم سے کہا ہے کہ ایک مرتبہ گھر جاؤ، ماں باپ بہن بھائیوں کو دیکھ آؤ۔ مگر تم کسی کی بات مانتے کب ہو۔ کتنے سال ہوئے ہیں جو تم گھر سے نکلے ہو۔ کتنی بار زخمی ہوئے، موت کے قریب پہنچے، علاج کیلئے پاکستان بھی گئے، مگر گھر نہیں گئے۔ معلوم نہیں کہ خود کو سزا دے رہے ہو یا پھر اپنوں کو۔ کس چیز کا بدلہ لے رہے ہو، نہ کوئی حال بھیجتے ہو نہ جاتے ہو، آخر کیوں؟ اللہ داد کی باتیں درد بھری تھیں۔

اللہ داد اخوند! مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور کیا چاہتے ہو۔ عبد الولی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ گاڑی کی طرف آہستہ آہستہ روانہ ہوا۔ عبد الولی ایسے انداز میں جارہا تھا جیسے کسی میدان جنگ میں سپاہی شکست کھا کر جارہا ہو اور سب کچھ گنوا بیٹھا ہو۔

میں تم سے پشتو میں مخاطب ہوں عربی نہیں بول رہا جو تم نہیں سمجھ رہے۔ میری اور تمھاری دوستی کو عرصہ ہوا ہے۔ میں تمھارے ہر درد کو سمجھتا ہوں۔ میں تمھیں کہہ رہا ہوں کہ تم کچھ دنوں کیلئے گھر کیوں نہیں جاتے؟ اللہ داد نے پھر وہی بات کی۔ کس گھر کی بات کر رہے ہو اللہ داد اخوند! اُس گھر کی جس میں میرے لیے رات گزارنے کی جگہ نہ تھی۔ ایک پیٹ کیلئے مجھے مسجد میں پھینک دیا اور دوسروں کے ہاتھوں میں دے دیا گیا۔ میرے ارمانوں پر مٹی ڈالی گئی۔ اُس گھر کی بات کرتے ہو جس میں میری ماں اور بہن بے بس تھے۔ صرف رونے کا حق اُنہیں حاصل تھا۔ اور اگر

(c) ketabton.com: The Digital Library

اپنوں کی بات کرتے ہو جو میرے چچا کے ٹکڑوں پر پلے بڑے ہیں۔ کس گھر کی بات کرتے ہو۔ عبدالولی کی برداشت کا مادہ پھٹ گیا۔ اس لیے جاؤں تا کہ چچیرے بھائی کی کڑوی باتیں سنوں، اُن کے طعنے سنوں۔ عبدالولی نے غصے میں کہا۔

عبدالولی اخوند! تم اب وہ پہلے والے عبدالولی نہیں رہے جو مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ تم اب ایک اسلامی ریاست کے ایک ضلع کی ایک خاص کرسی پر بیٹھے ہو۔ تم ایک خاص شخص ہو عام شخص نہیں۔ تم اب یہ کر سکتے ہو کہ گھر کے ساتھ ساتھ اپنوں کو بھی نفع پہنچاؤ، تمھاری بازوؤں میں طاقت ہے۔ اللہ داد نے اُسے تسلی دی۔

نفع؟ کس نفع کی بات کر رہے ہو۔ اُس نفع کی بات کر رہے ہو جسے یہ لوگ نفع سمجھ رہے ہیں۔ جس دن سے میں اپنے گھر سے نکلا ہوں میں نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا تھا کہ میں اپنے لیے کچھ نہیں کرونگا، جو کرونگا صرف خدا کیلئے کرونگا۔ اللہ داد اخوند! میں نے، میری ہر چیز اللہ کی راہ میں قربان کی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ دنیا کا نفع اور مزہ اپنی نظر میں رکھوں۔ میری دسترس میں سب کچھ ہے۔ اچھی شادی، اچھا گھر، اچھی زندگی۔ مگر ان سب سے مجھے گِھن آتی ہے۔ ایسی گِھن جو دوسروں کے ہاتھوں میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

اللہ داد نے جب عبدالولی کی باتیں سنیں تو اُسے اچھی نہیں لگیں۔ اُسے ایسے لگا جیسے عبدالولی نے بدلے کی راہ اپنائی ہو، اس لیے خاموش ہوا۔

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور اپنے اوطاق کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ دونوں اوطاق پر پہنچ گئے تو ضلعی امیر کی طرف سے پیغام آیا تھا کہ عبدالولی سے کہیں کہ وہ ضلع امیر سے ملیں۔ عبدالولی اور اللہ داد نے دوپہر کا کھانا کھایا، پھر ظہر کی نماز ادا کی اور پھر گاڑی میں سوار ہو کر ضلع امیر کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ عبدالولی کو ضلع امیر کے دفتر میں بڑے احسن طریقے سے خوش آمدید کہا گیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد ضلع امیر نے عبدالولی سے کہا۔

والی صاحب کی طرف سے پیغام آیا ہے۔ وہ کمک (مدد) مانگ رہے ہیں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

کیسی کمک امیر صاحب؟عبدالولی نے پوچھا۔

جنگ میں کچھ طالبان زخمی ہوئے ہیں۔ شمالی محاذ پر ہمارے خلاف سخت کاروائیاں جاری ہیں۔اس لیے انہوں نے تازہ دم طالبان کی کمک مانگی ہے۔ ضلع امیر نے بات کی وضاحت کی۔

وہ جونئے طالبان آئے ہیں انہیں اب تک تجربہ نہیں۔یعنی جنگ کا تجربہ۔۔۔۔۔۔

ہم کونسے فوج میں پلے بڑے ہیں۔ جنگ انہیں سب کچھ سکھا دے گی۔ جنگ کا میدان خود ایک استاد ہے۔ ضلع امیر نے عبدالولی کی بات پوری ہونے سے پہلے اپنا مقصد بیان کیا۔

تو پھر ٹھیک ہے، میں بھی اُن کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ عبدالولی نے کہا۔

نہیں تم اپنی ڈیوٹی پر رہو اللہ داد اخوند ساتھ چلا جائے گا۔ ضلعی امیر نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

امیر صاحب! اگر اللہ داد اخوند میری جگہ ڈیوٹی کرے اور میں اُن کے ساتھ چلا جاؤں اچھا ہو گا۔ کیونکہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حافظ صاحب! اتنی سخت ضرورت بھی نہیں کہ آپ کو بھیجا جائے۔ اگر ضرورت پڑی تو آپ کو بھی بھیج دیں گے۔ لیکن میں کہہ رہا ہوں کہ یہاں تمھاری بہت زیادہ ضرورت ہے۔اگر عوام کو پتہ چلا کہ حافظ صاحب یہاں نہیں ہیں تو اُن کو بُرائی سے روکنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے آپ جائیں اور اُن طالبان کو تیار کروا کر یہاں میرے دفتر بھیج دیں۔ پھر یہاں سے انہیں دارالخلافہ کی طرف روانہ کر دیں گے۔ ضلع امیر عبدالولی سے یہ کہہ کر اُٹھ گئے۔

عبدالولی بھی کھڑا ہوا۔ دونوں نے مصافحہ کیا اور رخصت ہو گئے۔

عبدالولی کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اللہ داد اُس سے علیحدہ ہو جائے۔ یہ دونوں ہر وقت، ہر جگہ، ہر میدان میں ساتھ ساتھ تھے۔اور کبھی بھی ایسا موقع نہیں آیا تھا کہ دونوں علیحدہ ہوئے ہوں۔ اللہ داد عبدالولی کیلئے سب کچھ تھا۔ بھائی، دوست، ماں، باپ۔ اللہ داد کیلئے بھی عبدالولی اسی طرح تھا۔ ان دونوں کے درد مشترک تھے۔ اللہ داد سے اپنوں کا پیار وقت کے بھیڑیوں نے چھینا تھا۔ماں کی ممتا کا پیاسہ، اللہ داد اپنی پیاس بجانے عبدالولی کے چہرے کو اس طرح دیکھ رہا تھا کہ ایک دن عبدالولی کی

(c) ketabton.com: The Digital Library

ماں اُس کا سر بھی اپنے بیٹے کی طرح اپنی گھود میں لے لیگی۔ عبد الولی کو چھوٹے بھائی کی طرح پیار کرتا۔ اُس کے ناز اُٹھاتا، بُرے وقت میں خود کو آگے کرتا، اچھے وقت میں عبد الولی کو آگے کرتا۔ اس لیے وہ عوام کی نظروں میں اس طرح نظر آتے کہ عبد الولی بڑا اور اللہ داد چھوٹا ہے۔ عبد الولی نے بھی نا امیدی کے زخم کھائے تھے، مگر یہ ایسے زخم نہ تھے جن کا علاج نہ تھا۔ مگر اللہ داد کے حصے میں امید نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ ایک دوسرے کے غم میں شریک اِن دونوں دوستوں کی دولت بس ایک دوسرے کا یہی ساتھ تھا۔ آج حالات نے اُسے بھی چھین لینے کیلیئے آستین چڑھا لیے تھے۔ عبد الولی کے ناچاہتے ہوئے بھی اللہ داد نے اپنے آپ کو علیحدہ ہونے کیلیئے تیار کر لیا۔ اس لیے کہ مجبور تھا۔ ضلع امیر کے حکم کو نا ماننا اسلامی مملکت کے قوانین نا ماننا تھے۔

اللہ داد کو بیس طالبان کے ساتھ ضلع امیر کے دفتر کی طرف رخصت کیا۔ وہ خود اپنے اوطاق پر دیگر طالبان کے ساتھ رہ گیا۔ اللہ داد عبد الولی کے ساتھ ہر وقت شانہ بشانہ رہتا۔ اگر گشت پر نکلتا یا پھر دوسری طرف جانا ہوتا۔ اسی طرح عبد الولی کو اللہ داد کے بغیر زندگی گزارنا مشکل تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اُس کا دایاں بازو کاٹ دیا ہو۔ اللہ داد کے بغیر عبد الولی نے اور سختی شروع کی۔ کسی سے کسی قسم کی رعایت برتنے کیلیئے تیار نہ تھا اور نہ ایسا کوئی تھا کہ جو اسے ٹوکے یا روکے۔ کسی کی اتنی ہمت نہ تھی۔ یہ کام صرف اللہ داد کر سکتا تھا جو اب یہاں نہیں تھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۱۳)

اللہ داد کے جانے کے بعد عبدالولی سارا وقت گشت پر گزارتا۔ اس طرح اُس کا کام بھی ہوتا او مشغول بھی رہتا۔ عبدالولی آجکل عصر کی نماز کے بعد شہر کی گلیوں میں پیدل گشت کرتا۔ اُن گلیوں میں جہاں گاڑی نہیں جاسکتی تھی۔ عبدالولی کی یہ کوشش ہوتی وہ ہر جگہ پہنچ جائے۔ چاہے وہ شہر کے اندر ہو یا باہر۔ سڑک ہو یا پھر گھر۔ ایسی جگہ نہ تھی جہاں عبدالولی پہنچنے کی کوشش نہ کرتا۔ اسی لیے لوگوں کے دلوں میں یہ خوف تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں حافظ صاحب نہ آجائے۔ اور ہمیں گریبان سے پکڑے۔ آج بھی جب وہ دو طالبان کے ساتھ پیدل گشت پر جارہا تھا تو ایک بچہ کسی کے گھر کے سامنے کھڑا رو رہا تھا۔ بچے کا چہرہ میلا، گریبان چاق، بغیر چپل پہنے کھڑا تھا۔ عبدالولی کو اپنا بچپن یاد آیا، اُس نے بھی اپنا بچپن اسی بچے کی طرح گزارا تھا۔ عبدالولی بچے کے قریب آیا۔

بچے کیوں رو رہے ہو۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟ عبدالولی نے پوچھا۔

بچہ اپنا رونا رو رہا تھا، اُس نے عبدالولی کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ عبدالولی بچے کے اور قریب ہوا اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر پوچھا۔

بولو کیوں رو رہے ہو؟

وہ۔۔۔

ماں نہیں چھوڑ رہی یا ابو۔ عبدالولی بچے کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ تم نے گھر میں مستی کی ہے جو وہ تمھیں نہیں چھوڑ رہے۔ عبدالولی نے اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

نہیں۔۔۔۔ ہمارا گھر۔۔۔۔۔ اوں۔۔۔ اوں۔۔۔۔۔ یہ نہیں ہے۔۔۔۔ یہ تو ۔۔۔۔۔جانان۔۔۔کا۔۔۔۔اوں۔۔۔گھر ہے۔۔۔۔۔بچہ اُسی طرح سسکیاں لے رہا تھا۔

جانان تمھارے ساتھ کھیلتا نہیں یا پھر جانان کی امی تمھیں اپنے گھر نہیں آنے دے رہی۔ عبدالولی نے پوچھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

کھیلتا تو میں وہاں ہو۔ بچے نے کھنڈر نما گھروں کی طرف اشارہ کیا۔

تو پھر یہاں کیوں آئے ہو شیر کے بچے۔ عبد الولی نے بچے کا گال کھینچتے ہوئے کہا۔

جانان کے گھر تو میں ٹی وی دیکھتا ہوں، وہ مجھے نہیں چھوڑتے۔ بچے نے کہا۔

ٹی وی؟ عبد الولی ایک دم کھڑا ہوا۔

یہاں ٹی وی لگتا ہے؟ عبد الولی نے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

بچہ عبد الولی سے ڈر کر اپنے گھر کی طرف بھاگ گیا۔

عبد الولی نے ایک طالب کو آواز دی۔

دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ عبد الولی کا پورا جسم غصے سے کانپنے لگا۔ تیور ایک دم بدل گئے۔ طالب نے جلدی سے وہ دروازہ کھٹکھٹایا، جس کے سامنے بچہ کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک صاف ستھرا خوبصورت بچہ جو پچھلے بچے کا ہم عمر تھا دروازہ کھول دیا۔

سلام! بچے نے دروازہ کھولنے کے ساتھ ہی سلام کیا۔

وعلیک! یہ تم لوگوں کا گھر ہے؟ عبد الولی نے غصے سے کہا۔

چھوٹا بچہ گھبرا گیا۔ نہیں۔۔ نہیں۔۔ ہاں۔۔ ہاں۔ اس سے پہلے کے بچہ اپنی بات پوری کرتا پیچھے سے کسی شخص نے آواز لگائی۔

جانان بیٹا کون ہے؟

جانان نے دروازہ اُسی طرح کھلا چھوڑا اور گھر کے اندر بھاگ گیا۔ وہاں سے ایک تیس یا پینتیس سالہ جوان دروازے پر آیا۔ جیسے ہی عبد الولی پر نظر پڑی چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

حافظ صاحب آپ! آیئے کیسے آنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس سے پہلے کہ جوان اپنی بات پوری کرتا عبد الولی نے غصے میں پوچھا۔

تمھارے گھر میں ٹی وی ہے؟

نہیں حافظ صاحب وہ تو۔۔۔۔۔۔۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

میری بات کا جواب دو۔ تمھارے گھر میں ٹی وی ہے یا نہیں؟ عبد الولی نے اور غصے سے پوچھا۔

ہے مگر میں نے لگایا نہیں ہے۔ جوان نے جواب دیا۔

تم نے نہیں لگایا؟ عبد الولی نے آنکھوں میں آنکھ ڈال کر پوچھا۔

جوان نے نظریں جھکالیں۔ جیسے اُس کی چوری پکڑی گئ ہو۔

خود نکالتے ہو یا میں طالبان کو اندر بھیجوں۔ عبد الولی نے کہا۔

حافظ صاحب نکالتا ہوں۔ جوان یہ کہتے ہی اندر چلا گیا۔

ان کی باتوں پر آس پاس کے کچھ لوگ گھروں سے باہر نکلے۔ عورتیں دروازوں کی دراڑ سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد جوان ایک چھوٹا ٹی وی لیے آیا۔ عبد الولی کے قدموں کے ساتھ نیچے زمین پر رکھ دیا۔

جاؤ وہ دوسری چیزیں بھی لے آؤ۔ عبد الولی نے کہا۔

کون سی چیزیں؟ جوان انجان سا بنا۔

اس ٹی وی میں تم کیا دیکھتے ہو۔ جاؤ وی سی آر، سی ڈی، کیسٹ وغیرہ لے آؤ۔ عبد الولی نے چیزوں کی نشاندہی کی۔

جوان آہستہ سے گھر کے اندر گیا، تھوڑی دیر بعد ایک گھٹڑی ہاتھ میں لیے آیا جس میں سی ڈی پلئیر اور سی ڈیز تھیں وہ بھی عبد الولی کے سامنے رکھ دیں۔

ٹیپ بھی ہے یا نہیں؟ عبد الولی نے پوچھا۔

نہیں، ٹیپ نہیں ہے۔ ایک ریڈیو گھر میں ہے۔ جوان کے ماتھے پر پسینے چھوٹنے لگے۔

ملا غازی اخوند! زرا تمھارا کلاشنکوف دینا۔ عبد الولی نے ایک طالب سے کہا۔

گلی میں کھڑے تمام لوگ پریشان تھے کہ اب کیا ہو گا۔ سب خاموش تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

عبدالولی نے کلاشنکوف کو اُس کی نلی سے پکڑا اور ٹی وی کو توڑنے لگا۔ ٹی وی کی سکرین میں سراخ بن گیا۔ پھر ٹی وی کو اٹھا کر دیوار سے مارا۔ ٹی وی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر سی ڈی پلئیر کو دیوار سے مارا۔ عبدالولی پاگلوں کی طرح حرکتیں کرنے لگا۔ سی ڈیز کو پاؤں سے تھوڑ رہا تھا۔ عمامہ اُس کے سر سے گر کر گردن میں تھی۔ جوان شخص دیوار کے قریب جاکر عبدالولی کو حیرانی و پریشانی سے دیکھ رہا تھا۔ عبدالولی نے جب اُن چیزوں کا کام تمام کر دیا تو کلاشنکوف جوان شخص کے سر پر رکھ کر کہا۔

اب پار کردوں تمھارے سر سے گولی؟ عبدالولی نے کلاشنکوف سے اُس کے سر کو دھکا دیا۔ جوان شخص کے ماتھے سے کلاشنکوف کی وجہ سے خون بہنے لگا۔ وہ سخت حیران تھا۔ اُس کے مُنہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

مولوی غازی اخوند! یہ چیزیں چادر میں ڈال کر لے چلو اور تم بھی چلو۔ شاباش۔ عبدالولی نے جوان شخص کو لات مار کر کہا۔

جوان شخص کے گھر سے ایک عورت بغیر دوپٹہ اوڑھے چیختی ہوئی نکلی۔

خدا کیلیئے میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، میرے خاوند کو چھوڑ دیں۔ عورت عبدالولی کے پیروں میں گر گئی۔

عبدالولی نے جلدی سے اپنا چادر عورت پر پھینکا، اُس کا سر اور بدن اُس سے ڈھک گیا مگر عورت نے عبدالولی کے پیر مضبوطی سے پکڑے تھے اور خدا کا واسطہ دے رہی تھی۔

عبدالولی اُسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا پیچھے ہٹنا چاہ رہا تھا لیکن عورت اُس کے پیروں سے ایسے چپک گئی تھی جیسے کیل۔

عبدالولی نے جوان شخص سے کہا۔

یہاں آؤ، اپنی بیوی کو گھر لے جاؤ۔ پھر عورت سے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

بہن! میں تمھارے شوہر کو کچھ نہیں کہونگا اگر تم یہاں سے اُٹھ کر گھر نہیں گئی تو میں یہی اُسے گولی ماردونگا۔ جوان شخص پر کلاشنکوف سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

عبدالولی کی دھمکی نے کام کیا، عورت کھڑی ہوگئی اور جوان شخص نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر گھر کے اندر لے گیا۔

عبدالولی نے لوگوں کی طرف مُنہ کرکے کہا۔ یہ کوئی تماشہ کرنے کی جگہ نہیں، عبرت کی جگہ ہے۔ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں اور ان چیزوں سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔ تم جاؤ اور تھوڑا ٹھنڈا پانی لے کر آؤ۔ عبدالولی نے ایک شخص جو کہ اپنے گھر کے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا کو کہا۔

دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں، دل میں ایک خوشگوار کیفیت کو محسوس کیا، اُسے ایسا لگا جیسے آج اُس نے اپنے چچا سے بدلہ لے لیا ہو۔ جس وقت عبدالولی بچہ تھا تو اُسے ٹی وی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اُس کے چچا کے گھر میں ٹی وی تھا اور اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ مگر وہ اُسے ٹی وی دیکھنے نہیں دیتے۔ عموماً وہ دروازے کے پیچھے کھڑا ہو کر ٹی وی کی آواز سنتا، گرچہ اُسے اُس کی تصویر دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اُسے ٹی وی دیکھنے نہیں دیتے کمرے سے نکال دیتے مگر وہ پھر بھی ڈھیٹ بنا رہتا اور وہاں سے نہ جاتا۔ پھر وہ لوگ ٹی وی بند کر دیتے۔

جاؤ یہاں سے منحوس شکل کہیں کے۔۔۔ تمھاری وجہ سے تو۔۔۔۔۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ چچا اُسے غصے سے کہتا۔

عبدالولی کے دل میں کارٹون دیکھنے کی حسرت رہ جاتی۔ مایوس سا دل لیے چچا کے گھر سے نکل جاتا۔ وہ اکثر مدرسہ میں یہ سوچتا کہ جب وہ بڑا ہو جائے گا تو سلیم کے گھر کا ٹی وی توڑ دے گا۔ گرچہ آج اُس نے سلیم کے گھر کا ٹی وی نہیں بلکہ کسی اور کا ٹی وی توڑا تھا مگر دل میں ایک سکون سا محسوس کیا۔

حافظ صاحب! پانی لیجئے۔ شخص لوٹے میں پانی لایا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اُس نے لوٹا مُنہ سے لگایا اور آدھا لوٹا ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اسی دوران وہ جوان شخص دوبارہ گھر سے باہر نکلا۔

دل چاہتا ہے کہ تمھارا مُنہ کالا کر کے، گدھے پر بٹھا کر پورے شہر میں گھماؤں۔ تمھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ ٹی وی اور سی ڈی دیکھنا جائز نہیں۔ اسی لیے تو ہم نے پابندی لگائی ہے۔ تمھیں اچھی طرح پتہ ہے پھر بھی یہ کام کرتے ہو۔ عبدالولی نے اُس جوان شخص سے کہا۔

حافظ صاحب! غلطی ہوگئی آئندہ پوری زندگی میں ایسا کام نہیں کرونگا۔ اس دفعہ معاف کریں۔ شخص نے کانوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

خیر آج تو بیوی کی وجہ سے بچ گئے۔ اگر آئندہ ایسی غلطی کرنے کی کوشش کی تو پھر مجھے پتہ ہے کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔

چلو چلیں یہاں سے۔ عبدالولی نے ساتھیوں سے کہا۔

مغرب کی نماز کے بعد وہ اپنے اوطاق پہنچے۔ وہاں اوطاق میں اور طالبان بھی آئے تھے جس میں اُس کے حجرے کا دوست روزی خان بھی تھا۔ عبدالولی روزی خان کے ساتھ گرمجوشی سے ملا۔ پھر اُسے اپنے کمرے میں ساتھ لے گیا۔

ملا روزی خان اخوند! خدا خیر نصیب کرے۔ یہ کیا آپ کیسے اس طرف آنکلے۔ عبدالولی نے پوچھا۔

تم تو ویسے بھی حال نہیں پوچھتے اس لیے مجھے خود ہی آنا پڑا۔ روزی خان نے جواب دیا۔

کہاں ہو، کیسے ہو، کیا کر رہے ہو؟ عبدالولی نے سوالوں کے پُل باندھ دیے۔

عبدالولی اخوند! بالکل ٹھیک ہوں، ایک چھوٹی سی امامت ہے جس پر گھر کا گزارا ہوتا ہے۔ روزی خان نے جواب دیا۔

گھر بھی ڈھونڈا ہے یا پھر باپ کے گھر کی بات کر رہے ہو۔ عبدالولی نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

باپ کا گھر کہاں ہمارا تھا۔ اپنا گھر ہے، ملانی ہے، دو بچے ہیں۔ مقتدیوں نے مسجد کیساتھ ایک چھوٹا گھر دیا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ روزی خان نے اپنا حال بیان کیا۔

اس طرف کیسے آنا ہوا، جہاد کیلئے تو نہیں آئے؟ عبد الولی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

کیا ملانی کے ہاتھوں گھر سے نکلوانا ہے، چھوڑو یار جہاد کو۔ تم تو جانتے ہو کہ مولوی ملانی کی باتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ روزی خان نے ہنستے ہوئے کہا۔

مجھے نہیں پتہ کہ اُس میں کیا کرامات ہوتی ہیں۔ جس طالب نے بھی شادی کی ہے وہ پھر گھر سے نکلتا تک نہیں۔ عبد الولی نے کہا۔

عبد الولی اخوند! ہمارا ہے ہی کیا اور زندگی میں بس یہی ایک ملانی ہی ہے جس کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ اور تو ہم پر سب حرام ہیں۔ اور اگر جب دل چاہے بھی تو دنیا کی شرم سے نہیں کر سکتے۔ روزی خان نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

کیا مطلب؟ کیا دل چاہتا ہے۔ عبد الولی نے پوچھا۔

مطلب و طلب چھوڑو یہ بتاؤ ملانی ڈھونڈلی ہے یا پھر ابھی تک کنوارے ہو۔ روزی خان نے عبد الولی کی بات ٹال دی۔

جب یہاں سے فارغ ہو جاؤں تو پھر ملانی کے بارے میں سوچونگا۔ فی الحال تو اُسی طرح ہوں جیسے پہلے تھا۔ تم کہو، وطن میں کیا حال ہے۔ مدرسہ کے دوست کیسے ہیں؟ عبد الولی نے پوچھا۔

عبد الولی اخوند! وطن اُسی طرح ہے جیسے تھا۔ لوگوں کے پاس دولت زیادہ ہے جو فضول کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔ مگر مولوی اور طالب نے ابھی تک پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ وہی پرانی ریت، زکوٰۃ اور خیرات پر گزارا۔ روزی خان نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مولوی تو بھرا پیٹ کھاتا ہے مگر بھوکا، بھوکا تو طالب بیچارہ رہتا ہے۔ اُسے کون پوچھتا ہے۔ اگر گاؤں میں کوئی فوتگی ہو، قرآن خوانی ہو یا پھر کسی بچے کے کان میں آذان دینا ہو تو پھر طالب ہر کسی کو یاد ہوتا ہے ورنہ طالب تو ایسا ہے جیسا ایک فقیر۔ عبدالولی نے کہا۔

عبدالولی اخوند! مولوی اور طالب میں کوئی خاص فرق نہیں۔ روزی خان نے کہا۔

کیوں بھول گئے ہمارے مدرسہ کے مہتمم کو۔ کیسے وہ اپنے اور اپنے گھر کیلئے گوشت لے جاتا۔ لوگ اُسے ہمارے لیے چندہ دیتے مگر وہ خود اپنے لیے گوشت لے جاتا۔ میں جس مدرسہ میں سب سے پہلے ابتدائی درس پڑھنے گیا تو وہاں کا مولوی اور ملانی ہر روز گوشت کھاتے۔ وظیفے میں اکھٹا کرتا اُن کیلئے۔ ایک دن بھی مجھے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ آج ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ عبدالولی نے کہا۔

عبدالولی اخوند! تم بھی کمال کرتے ہو جب طالبی کے دور میں اتنی بھوک و افلاس گزاری ہو تو اتنا حق تو بنتا ہے۔ جب مولوی بنے تو آرام سے زندگی گزارے۔ روزی خان نے کہا۔

روزی خان اخوند! طالب کی بھی عجیب زندگی ہوتی ہے۔ بھوک، گرمی، سردی میں بڑی ہمت اور محنت سے پڑھتا ہے۔ پھر جب دستار بندی ہوتی تو نا ختم ہونے والی بے روزگاری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جسے پیش امام کی نوکری ملے تو وہ بادشاہ کا بھانجا بن جاتا۔ اور کام کاج کا نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں سکول والے اچھے ہیں۔ سب کچھ ان کیلئے ہے۔ ہمارے لوگ پتہ نہیں اتنے زیادہ مدارس کیوں بناتے ہیں۔ عبدالولی نے چند الفاظ میں طالبان کی زندگی کی تصویر پیش کی۔

تمھاری بات ٹھیک ہے عبدالولی اخوند! خدا افغانستان میں امارت اسلامی کو کامیابی نصیب کرے۔ طالبان کے یہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ روزی خان نے خوشامد کے انداز میں کہا۔

حافظ صاحب! کھانا تیار ہے آجائیں۔ ایک چھوٹے طالب نے عبدالولی سے کہا۔

کھانا کھانے کے بعد پھر دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔ عبدالولی نے روزی خان سے پوچھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

تم نے بتایا نہیں کیسے آنا ہوا؟

عبد الولی اخوند! دو سال پہلے میں نے یہاں دو نوجوان بھیجے تھے۔ آج تک اُن کا کوئی اتہ پتہ نہیں۔ والدین نے بہت تنگ کیا ہے۔ کہتے ہیں خود تو بیٹھے ہو اور ہمارے بچوں کو بھیج دیا۔ نا کوئی حال نا احوال مجبور ہو کر آنا پڑا۔ پتہ چلا تم یہاں اچھے عہدے پر ہو ہو سکے تو میری مدد کرو۔ روزی خان نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔

کس کے ساتھ بھیجا تھا؟ عبد الولی نے پوچھا۔

جس مدرسہ سے تم لوگ آئے تھے وہاں سے بھیجا تھا۔ پھر کئی بار پوچھا مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب کچھ دنوں پہلے بعض شہدا لائے گئے، ان کے والدین کو بھی تشویش لاحق ہے۔ روزی خان نے جواب دیا۔

خدا سب خیر کرے گا۔ یہاں میرے ساتھ کچھ دن گزار لو، پردیسی بھی ہو جاؤ گے اور جوانوں کا حال بھی معلوم ہو جائے گا اگر خدا نے چاہا تو۔ عبد الولی نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۱۴)

ایک ہفتے بعد عبدالولی نے ملا روزی خان سے کہا۔

تیار ہو جاؤ جانا ہے۔ قندہار کے بڑے جیل کے جیلر سے ملنے۔ میں نے سنا ہے کہ انہیں کچھ طالبان قیدیوں کے بارے میں معلومات ہے، اُس کے پاس کچھ ہزارہ بھی قید ہیں جو طالب اُن کے پاس قید ہیں اُن کے نام والی صاحب نے دیے ہیں۔ اُن کے بدلے ہزارہ قیدیوں کی چھوڑنے کی بات ہوئی ہے۔ جیلر میرا دوست ہے، اُن سے معلوم کرتے ہیں۔ اگر یہ جوان وہاں ہوئے تو ٹھیک اور اگر وہاں نہ ہوئے تو دوسری لسٹ ہے۔ جو طالبان شہید ہوئے ہیں اُس میں دیکھ لیتے ہیں۔ یہ لسٹ والی صاحب کے دفتر میں ہے۔ ہر کسی کو وہ نہیں دکھاتے۔

کس وقت جانا ہے؟ روزی خان نے پوچھا۔

کل صبح سویرے اگر خدا نے چاہا، تاکہ وہاں وقت پر پہنچ سکیں۔ عبدالولی نے کہا۔

دوسری صبح عبدالولی، روزی خان اور تین دوسرے طالبان گاڑی میں سوار ہو کر قندہار کی طرف روانہ ہوئے۔ ساڑھے دس بجے انہوں نے قندہار جیل کے سامنے گاڑی کھڑی کی۔ ایک طالب نے جا کر جیل کے چوکیدار سے عبدالولی کے بارے میں کہا۔ کچھ دیر بعد یہ لوگ جیلر کے دفتر میں بیٹھے تھے۔

حافظ صاحب! خدا کرے کہ آپ ہمیشہ یہاں تشریف لائیں۔ بہت دل چاہ رہا تھا کہ آپ سے ملوں مگر کیا کروں حالات ہی ایسے ہیں کہ فرصت نہیں ملتی۔ اچھا ہوا آپ خود تشریف لے آئے۔ جیلر جو کہ شکور اخوندزادہ کے نام سے مشہور تھا نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

اخوندزادہ صاحب! یہ آپ لوگوں کی محبت ہے جو مجھ جیسے ملنگ آدمی کی ملاقات کے خواہشمند ہیں۔ دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا لیکن مجبوری وہی جو آپ نے بیان کی۔ عبدالولی نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

خدا آپ جیسے ملنگوں کی تعداد میں اضافہ کرے تاکہ زمین سے تمام منکرات ختم ہو جائیں۔ آپ کی کارکردگی قابل تعریف ہے۔ عموماً مجالس میں آپ کی کارکردگی کا ذکر ہوتا ہے۔ شکور اخوندازادہ نے جواب دیا۔

اخوندزادہ صاحب مجھے معلوم نہیں کہ اچھا کر رہا ہوں یا بُرا۔ مگر اپنے بس اور علم کے مطابق اپنی ذمہ داری سرانجام دے رہا ہوں۔ عبدالولی نے کہا۔

حافظ صاحب! آپ کی بات سے یاد آیا۔ یہاں جیل میں ایک عجیب آدمی ہے۔ عمر پچاس کے لگ بھگ ہے۔ جب سے میں آیا ہوں قریباً ایک سال ہونے کو ہے میں نے اس شخص کو سوتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اچھی اور بُری باتوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ انہوں نے ایک نظریہ تخلیق کیا ہے۔ میری اُن سے اتنی زیادہ باتیں نہیں ہوئیں، طالبان کہتے ہیں کہ پہلے وہ تحریک کا ساتھی تھا مگر اب وہ جیل میں ہے۔ شکور اخوندزادہ نے عبدالولی سے کہا۔

اس شخص سے ملنا پڑے گا تاکہ اس کے نظریئے کو سمجھ سکوں۔ عبدالولی نے شخص سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

کیوں نہیں۔ شاید آپ اور وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ اخوندزادہ نے کہا۔

اخوندزادہ صاحب! آدمی سے بھی مل لیں گے پہلے جس کام کیلئے ہم آئیں ہیں اگر آپ اُس کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔ عبدالولی نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

کیوں نہیں، کیسا کام ہے، آپ حکم کریں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ شکور اخوندزادہ نے کہا۔

حکم نہیں عرض ہے۔ یہ میرا بہت قریبی دوست ہے ملا روزی خان اخوند۔ ان کا ایک کام ہے اگر معلومات کروادیں تو بہت مہربانی ہوگی۔ عبدالولی نے روزی خان کو متعارف کروایا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

پھر عبدالولی نے روزی خان اخوند سے کہا کہ آپ خود بیان کریں۔ ملا روزی خان اخوند نے شکور اخوندزادہ کو اپنا مسئلہ بیان کیا۔ پھر دونوں کاغذوں کے ڈھیر میں دیکھنے لگے۔ عبدالولی جیل میں اُس شخص کے پاس گیا جس کا ذکر شکور اخوندزادہ نے کیا تھا۔

حافظ صاحب! یہ وہ بوڑھا ہے۔ ایک طالب نے عبدالولی کو ایک شخص کے سامنے کھڑا کیا جو اپنے بیرک میں دروازے کے ساتھ بیٹھا تھا۔

السلام علیکم! عبدالولی نے شخص کو سلام کیا۔

وعلیکم السلام! مانده نه باشی۔

زندہ باشی۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ عبدالولی نے اپنے مزاج کے برعکس نرم لہجے میں کہا۔

طبیعت۔۔۔۔۔۔ بوڑھا شخص مسکرایا۔ جیل میں کسی کی طبیعت کیسی ہو سکتی ہے۔ بوڑھے شخص نے عبدالولی کو دیکھا۔

میرا مطلب تھا کہ۔۔۔۔۔ عبدالولی کچھ شرمندہ سا ہوا،

نوجوان تم شرمندہ نہ ہو، یہ تو روایتی حال احوال ہیں۔ کوئی پرواہ نہیں۔ تم بتاؤ، تم کس مقصد سے آئے ہو۔ مجھے تو ایک سخت جان طالب دکھائی دیتے ہو۔ بوڑھے شخص نے عبدالولی سے کہا۔

چچا یہ سخت جان کیا ہے۔ میں کچھ سمجھا نہیں، میں ایک طالب ہوں اور بس۔ یہ سخت جان اور نرم کا میں فرق نہیں کر سکتا۔ عبدالولی وہی بوڑھے کے قریب بیٹھا۔

اتنے معصوم بھی نہیں ہو، جو سخت اور نرم کو نہیں سمجھتے۔ بوڑھے نے کہا۔

آپ تو واقعی دلچسپ آدمی ہیں۔ عبدالولی نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

تمھاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم خاص مجھ سے ملنے آئے ہو۔ بوڑھے نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

شکور اخوند نے آپ کے بارے میں بتایا تو دل نے چاہا کہ آپ سے مل لوں۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

شکور اخوندزادہ بھی ایک سخت جان طالب ہے، تم کیا کہتے ہو؟ بوڑھے نے ایسے انداز میں پوچھا جیسے وہ عبد الولی کو پہلے سے جانتا ہو۔

چچا میں نے پہلے بھی کہا کہ میں سخت اور نرم کو نہیں سمجھتا۔ کون سخت اور کون نرم ہے۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

تمھاری کونسی ذمہ داری ہے؟ بوڑھے نے عبد الولی سے پوچھا۔

ایک شرط پر بتاؤنگا۔ عبد الولی نے کہا۔

کیوں نہیں، میں تو ایک کھلی کتاب ہوں جو ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔ بوڑھے نے طنزیہ انداز میں کہا مگر عبد الولی سمجھ نا سکا۔

میرا نام عبد الولی ہے، اس صوبے کے ایک ضلع میں " امر بی المعروف ونھی عن المنکر " کی ذمہ داری کندھوں پر ہے۔

خیر خدا خیر۔۔۔ عبد الولی نے بات پوری نہیں کی تھی کہ بوڑھے نے اپنے آپ سے کہا۔ بوڑھے نے یہ ایسے انداز میں کہا کہ عبد الولی کو ہنسی آ گئی۔

یہ کیا بیوہ عورتوں کی بات کر ڈالی۔ عبد الولی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

درس کتنا پڑھا ہے؟ بوڑھے نے پوچھا۔

قرآن شریف حفظ کیا ہے اور ہدایہ پڑھا ہے کہ جہاد کیلئے نکل پڑا۔

حافظ ہو۔ حافظ تو اس قابل ہوتے ہیں کہ اُنہیں سر پر بٹھایا جائے۔ بوڑھے نے عبد الولی کو پیار سے دیکھا پھر پوچھا۔ تمھیں جو ذمہ داری سونپی گئی ہے تمھارے خیال سے تم اس کے معیار پر پورے اُترتے ہو۔ علم کے راستے دنیا نے جو ترقی کی ہے، بہت چیزیں جو ایجاد ہوئیں ہیں، اُن میں عوام کو کس چیز کی ضرورت ہے اور کس چیز کی ضرورت نہیں۔ بہت سی ایسی چیزیں جو

(c) ketabton.com: The Digital Library

جدید تعلیم کے ذریعے سامنے آئی ہیں بہت منافع بخش ہیں۔ مگر وہ چیزیں تمھارے دین میں منکرات میں سے مانی جاتی ہیں، اس حال میں تمھاری ذمہ داری اور علم تمھیں اس قابل بنا سکتا ہے کہ تم معاشرے اور عوام کے ساتھ انصاف کر سکو۔ یا پھر اُن کو سمجھا سکو کہ کیا بُرا ہے اور کیا اچھا۔ بوڑھے نے ایک عالم کی طرح بات کی۔

عبدالولی حیران ہوا کہ بوڑھا کیا کہہ رہا ہے۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، وہ تو ایک سیدھا سادہ طالب تھا جو حجرے سے میدان جنگ اور پھر میدان جنگ سے ایک خاص ذمہ داری پر۔ حیران تھا کہ کیا جواب دے۔

میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو میری باتیں تمھیں عجیب لگ رہی ہیں۔ مگر میں کیا کروں عادت سے مجبور ہوں۔ نہ وقت کو دیکھتا ہوں اور نہ موقع کو۔ بس جو مُنہ میں آیا کہہ دیتا ہوں میرے پاس اور بچا بھی نہیں بس یہی باتیں ہیں جو میرے بس میں ہیں اور تو۔۔۔۔ بوڑھے نے عبدالولی کے گٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

چچا! اتنی گہری باتیں کرتے ہو جس کے سمجھنے کیلئے آپ کے جتنی عمر بھی چاہیئے۔ باتوں باتوں میں اپنا وعدہ بھول گئے۔ آپ نے اپنا تعرف نہیں کروایا۔ آپ کون ہیں، یہاں کیسے پہنچے۔؟ عبدالولی کو بوڑھے کو پہچاننا اُس کی باتوں سے زیادہ اہم تھا۔

حافظ صاحب! میرا نام دانش ہے۔ عمر کا پتہ نہیں کہ کتنی ہوگی۔ وہ اس لیے کہ میرے والد ان پڑھ تھے۔ میری تاریخ پیدائش اُسے معلوم نہ تھی۔ اس لیے ملک کے باسی مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ میں ان پڑھ باپ کا پڑھا لکھا بیٹا ہوں۔ خیر یہ تو زندگی میں ہوتا رہے گا یہ تو زندگی سے جُڑے قصے ہیں۔

آپ یہاں جیل میں کیسے آئے؟ عبدالولی نے بوڑھے کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

یہ چھوٹا کمرہ دیکھ رہے ہو۔ بوڑھے نے اپنے بیرک کی طرف اشارہ کیا۔

ہاں۔ عبدالولی نے سر ہلایا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

میری آدھی سے زیادہ زندگی اس میں گزری ہے۔ اس کمرے میں ایسا لگتا ہے جیسے یہ بنایا ہی میرے لیے گیا ہے۔

میرے خیال میں جرم کے ساتھ دوستی بنالی ہے۔ عبدالولی کے مُنہ میں بات نہیں رُکی۔

ہو سکتا ہے اسی طرح ہو۔ بوڑھا مسکراتے ہوئے۔

کس جرم کی سزا گزار رہے ہو؟ عبدالولی کے بوڑھے کے جرم میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

میں نے سنا آپ یہاں قیدیوں کو باجماعت نماز پڑھاتے ہو۔ تو پھر۔۔۔۔۔۔۔ عبدالولی نے بات پوری نہ کی۔

تو پھر میں عادی مجرم کیوں؟ یہی کہنا چاہتے ہو۔ بوڑھے نے عبدالولی کو ترچھی آنکھوں سے دیکھا۔

عبدالولی نے اثبات میں سر ہلایا۔

حافظ بھائی! میرا جرم میری زبان ہے۔ بوڑھے نے اپنی زبان نکالی اور اُس پر انگلی رکھی۔

یہ زبان مجھے یہاں پر لے کر آئی ہے۔ اس زبان کے پیچھے جو عقل ہے وہ جو سوچتی ہے یہ سوچ سب سے بڑا مجرم ہے۔ لوگ میری زبان کو تالا لگانا چاہتے ہیں کہ یہ سوچتا ہے، لیکن میری زبان اس پابندی کو نہیں مانتی۔۔۔۔۔۔

کس طرح کی سوچ بیان کرتے ہو؟ عبدالولی نے پھر بات کاٹی۔

اسی جلدبازی نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ جلدبازی مت کرو، تمھارا قیمتی وقت ضائع نہیں کرونگا چند جملوں میں اپنی زندگی کا حال بتادونگا سمجھنا تمھارا کام ہے۔ بوڑھے نے عبدالولی سے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

جس وقت ظاہر شاہی تھی میرا فکر آزادی کی باتیں کرتا تھا۔ ایسے نظام کے بارے میں جس میں ہر کسی کو زندگی گزارنے کا پورا پورا حق ہو۔ وہ عورت ہو یا مرد، تعلیم حاصل کرے، عصری اور دینی دونوں۔ عوام صرف بادشاہ کی خدمت میں نہیں بلکہ ملک کی خدمت میں کھڑے ہوں اور اس ملک کو دنیا کے دیگر ممالک کے ساتھ برابر کھڑا کریں۔ یہاں پر فیکٹریاں، صنعتیں اور سڑکیں بنیں۔ پھر ایسے لوگ پیدا ہوئے کہ ہم یہ سب لاسکتے ہیں۔ ان چیزوں کے نام پر وہ انقلاب لے آئے۔ میں اس انقلاب کے ہراول دستے کا آدمی بنا۔ ہر جگہ حمایت کرتا اس لیے کہ وہ یہ سب کچھ چاہتے تھے جن کا میں سوچ رہا تھا۔ کچھ عرصہ یہ چیز مجھے نظر میں نہیں آرہی تھی، عوام کی بجائے ایک خاص مکتبہ فکر کی افزائش ہونے لگی۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ وہ نظام نہیں جو میرے ذہن میں تھا۔ باتوں اور عمل کے بیچ میں فرق تھا اسی لیے میں نے اُن کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اُن لوگوں کے خلاف جو انقلاب کے نام پر عوام کے احساسات اور جذبات سے کھیل رہے تھے۔ اُن کی خرابیوں کی نشاندہی شروع کی، وہ مجھے یہاں لائے کہ ہمارے اس ساتھی کا کچھ دماغی مسئلہ ہے۔ اگر علاج نہ ہوا تو کیا، لوگوں کو تو کم از کم ورغلائے گا نہیں۔ پھر مجاہدین آئے میں خوش ہوا کہ اب اس دربہ در عوام کے ساتھ انصاف ہو گا۔ عوام کی ہر چیز کے ساتھ ایسا انصاف ہوا کہ لوگوں کو انصاف کے نام سے نفرت ہونے لگی۔ میرے ساتھ بھی انصاف ہوا اور میں یہاں لایا گیا کیونکہ میں نے پھر وہی گناہ کیا جو میں نے انقلابیوں کے دور میں کیا تھا۔

پھر کیا؟ عبدالولی نے جلدی سے پوچھا۔

پھر تم لوگ آئے یعنی طالبان۔ میں بہت خوش تھا کہ یہ لوگ ملک میں خوشحالی اور انصاف لائیں گے۔ بھائی چارہ لائیں گے۔ پاک دین اسلام کی احیا ہو گی مگر۔۔۔۔۔۔۔

مگر کیا؟ عبدالولی کے لہجے میں احتجاج نظر آرہا تھا۔

مگر یہ کہ انقلابیوں نے انقلاب کو اپنی مرضی کا نام دیا اور اپنی مرضی کے قوانین بنائے جو کہ عوام کی خوشحالی اور امن کی بجائے گھاٹے اور جھگڑے کا باعث بنی۔ اور پھر آپ لوگ

(c) ketabton.com: The Digital Library

آئے۔ اسلام کے نام پر اپنے قوانین بنائے۔ اسلام کو اپنی خوشی سے تعبیر کرایا۔ صرف عبادات اور سزا کو مد نظر رکھا۔

میں نے اسے اسلامی نظام کی بجائے مولوی نظام کا نام دیا۔ یہ مجھے یہاں لے کر آئے۔ کہتے ہیں کہ تم مجرم ہو۔ بس میں اس جرم کا عادی ہوں۔ بوڑھے نے چند جملوں میں اپنی زندگی کی سرگزشت بیان کی۔

عبدالولی زور سے ہنسا۔ بوڑھا شخص اُسے دماغی مریض نظر آیا۔ آپ کے خیال میں یہ کیوں ایسا کرتے ہیں؟ عبدالولی نے پوچھا۔

وہ اس لیے کرتے ہیں کہ پیٹھ پیچھے اسلامی لباس میں وہ خفیہ قوتیں نظر آتے ہیں جنہیں یہ دیکھ نہیں سکتے۔ کام وہ کرتے ہیں نام انکا استعمال ہوتا ہے۔ جو لوگ سوچتے ہیں اور اس طرح سوچتے ہیں انہیں اس طرح قید کیا جاتا ہے جس طرح مجھے۔ بوڑھے نے جواب دیا۔

تو آپ کے خیال میں ہمارا نظام اسلامی نہیں ہے، اگر نہیں تو پھر یہ امن، خوشحالی۔ اوہو، میں تو بھول ہی گیا، آپ تو یہاں ہیں آپ کو کیا پتہ کہ باہر لوگ کتنے خوش ہیں۔ عبدالولی نے فخر سے کہا۔

خوش نہیں، ڈر رہے ہیں۔ ڈر کے مارے بیچارے کچھ بول نہیں سکتے۔ دونوں یہی باتیں کر رہے تھے کہ ایک طالب آیا اور عبدالولی سے کہا کہ اخوندزادہ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ عبدالولی نے بوڑھے سے رخصت لی، اخوندزادہ کے دفتر میں آیا۔ شکور اخوندازادہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

حافظ صاحب! کہو کیسا تھا بوڑھا شخص؟

اخوندزادہ صاحب! بڑا بے باک شخص تھا جو مُنہ میں آتا کہہ دیتا۔ اچھی باتیں کر رہا تھا مگر ایک بات پر مجھے شک ہوا کہ وہ ایک دماغی مریض ہے۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

کونسی بات پر؟ شکور اخوندزادہ نے پوچھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہمارے اس نظام کو اسلامی نظام کی بجائے مولوی نظام کہہ رہا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے دماغی مریض لگا۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

آدمی عالم ہے مگر کیا کریں حافظ صاحب۔ اس طرح کے لوگ ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شروع میں یہ شخص تحریک کا ایک سرگرم رکن تھا۔ پھر بعد میں اس طرح کی باتیں کرنے لگا۔ خیر یہ تو ہوتا ہے۔ ہم کسی کا مُنہ نہیں سی سکتے۔ اخوندزادہ نے کہا۔ میں نے ملاروزی خان اخوند کو تمام معلومات فراہم کرائیں ہیں۔ اب چلتے ہیں کھانا کھانے، اس کے بعد میں آپ لوگوں کو رخصت دونگا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۱۵)

عبدالولی اللہ داد کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔ فکر مندی کے ساتھ ساتھ بور بھی ہورہا تھا۔ اُس کی زندگی میں اللہ داد ہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ عبدالولی دل کی بات کہتا۔ تنہائی کے درد کی دوا کرتا۔ اگرچہ عبدالولی اپنے آپ میں ایک پُراِسرار شخصیت کا مالک تھا اسی لیے اللہ داد کے سوا کوئی بھی اس کے ماضی سے باخبر نہ تھا۔ عبدالولی کو زندگی نے جو کچھ بھی دیا تھا اُس نے شعور کے بجائے لاشعور میں اپنی جگہ بنالی تھا۔ وہ خواہشات اور ارمان جو بچپن سے اُس کے دل و دماغ میں پل رہے تھے حالات نے بجائے پورے کرنے کے ادھورے چھوڑ دیے۔ ان ادھوری خواہشات اور ارمانوں نے اس کے دل و دماغ کو ایک قبر بنارکھا تھا۔ اس قبر کے مجاور کا حق صرف اللہ داد کو دیا تھا۔ اس لیے کہ اُس نے اور اللہ داد نے اپنے ارمان اس قبر کو سونپے تھے۔

اللہ داد کا کوئی حال احوال بھی نہیں آیا تھا۔ وہاں میدان جنگ بھی کچھ زیادہ گرم ہوچکا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد عبدالولی اپنے کمرے میں آیا۔ سٹلائیٹ فون پر کئی جگہوں کی معلومات اکھٹی کی لیکن حالات کچھ تسلی بخش نہ تھے۔ اللہ داد کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل نہ ہوئیں۔ اسی سوچ میں عبدالولی اپنی بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ مختلف قسم کے خیالات اُس کے دماغ میں آرہے تھے۔ وہ جتنی دیر آنکھیں بند کرتا نیند اتنی دور چلی جاتی۔ اسی کشمکش میں بالاخر اُسے نیند آگئی۔ وہ پھر سے وہی خواب دیکھ رہا تھا جو وہ ہر وقت دیکھتا آرہا تھا اس دفعہ خواب میں اس کے سینے کی روشنی ایسی ماند پڑ گئی تھی جیسے ڈھلتا سورج، نارنجی روشنی کی طرح۔ عبدالولی پریشان تھا کہ یہ روشنی نارنجی کیوں ہوگئی، اسی پریشانی میں تھا کہ اژدھا نظر آگیا۔ مُنہ کھلا ہوا روشنی کے سامنے بیٹھا بچوں کی تعداد میں بھی کمی آئی تھی۔ اژدھا کے آنے سے تمام بچے ایک دوسرے سے چمٹنے لگے۔ اژدھا اچانک ایک بچے کی طرف بڑھا۔ عبدالولی اُس کی طرف لپکا۔ اس کشمکش میں آنکھ کھل گئی۔ اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے حواس اپنی جگہ پر نہیں آئے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھٹکا۔ اُسے ایسے لگا جیسے دروازے پر اژدھا ہو۔ وہ خوف زدہ ہو کر دروازے کی طرف

(c) ketabton.com: The Digital Library

دیکھنے لگا پھر سرہانے پڑے کلاشنکوف کی طرف ہاتھ بڑھایا، کلاشنکوف اٹھاتے ہی آواز دی۔ کون ہو؟

میں محمد گل ہوں حافظ صاحب۔ باہر سے جواب ملا۔

اُس نے واپس کلاشنکوف رکھی اور جا کر دروازہ کھولا۔

ہاں محمد گل اخوند! کیا بات ہے جو آدھی رات کو دروازہ کھٹکھٹا رہے ہو۔ خیر تو ہے۔ عبدالولی نے پوچھا۔

حافظ صاحب! دو طالبان آئیں ہیں، کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ابھی حافظ صاحب سے ملانا ہے۔ ایک ضروری پیغام دینا ہے۔ محمد گل نے کہا۔

کہاں سے آئے ہیں، ضلعی امیر نے بھیجے ہیں یا پھر والی صاحب نے یا پھر کہیں اور سے؟ عبدالولی نے پھر پوچھا۔

والی یا ضلعی امیر کے طرف سے نہیں آئے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک لمبا سفر طے کر کے آئے ہوں اور بہت دور سے آئے ہوں۔ محمد گل نے جواب دیا۔

جاؤ لے آؤ، جلدی۔ عبدالولی واپس کمرے کے اندر گیا۔

محمد گل اُن دونوں طالبان کو کمرے میں لے آیا۔ تھوڑی دیر بعد کالا عمامہ باندھے عبدالولی کمرے سے نکلا اور محمد گل کو آواز دی۔

محمد گل اخوند، جلدی سے گاڑی نکالو۔ عبدالولی کی آواز کانپ رہی تھی۔

حافظ صاحب! خیر تو ہے پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ گل محمد نے پوچھا۔

تم جلدی کرو گاڑی نکالو شاباش، تم بھی ساتھ چلو بارڈر (ویش) تک۔ پھر واپس گاڑی لے کر آجاؤ گے۔ عبدالولی نے کہا۔

محمد گل نے جب عبدالولی کی حالت کو دیکھا تو دوبارہ پوچھنے کی جراءت نہ کر سکا اور بھاگ کر گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی سٹارٹ کی۔ دونوں روانہ ہوئے، بارڈر پہنچتے ہی عبدالولی نے محمد گل

(c) ketabton.com: The Digital Library

کو رخصت کیا، خود دروازے کی طرف بڑھا۔ گرچہ بارڈر کا دروازہ بند تھا اور صبح سورج نکلنے کے ساتھ ہی لوگوں کی آمدورفت کیلئے کھلتا مگر عبدالولی ان تمام پابندیوں سے آزاد تھا۔ کسی نے اُس کا راستہ نہ روکا۔ جیسے ہی سورج کی کرنیں شفق سے نظر آئیں عبدالولی درہ خوجک (کوژک) کو عبور کر چکا تھا۔ عبدالولی نے بارڈر سے ایک مخصوص گاڑی اپنے لیے کرایہ پر لی، اکیلا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ محمد گل بارڈر تک اُس کے ساتھ تھا۔ بارڈر کراس کرنے کے بعد عبدالولی نے اپنا سفر اکیلا جاری رکھا۔ عبدالولی گاڑی میں ایسے بیٹھا تھا جیسے کانٹوں پر۔ دل چاہ رہا تھا کہ گاڑی اُڑے اور اُسے کوئٹہ تک پہنچادے۔ ذہن میں مختلف خیالات آرہے تھے۔ مرچکا ہوگا۔۔۔ نہیں خدا نہ کرے۔ پھر وہ سر کو ہلادیتا۔ کتنا زخمی ہوگا جو اتنی جلدی کوئٹہ پہنچایا گیا ہے۔ ضرور بہت زخمی ہوگا۔

عبدالولی کو آئے ہوئے طالبان نے کہا کہ ملا اللہ داد اخوند جنگ میں زخمی ہوا ہے اور اُسے سراچہ گاڑی میں کوئٹہ لے گئے ہیں۔ ہم آپ کے پاس اس لیے آئیں ہیں کہ اللہ داد اخوند کی خواہش تھی کہ عبدالولی کو اُس کے بارے میں بتایا جائے۔ میرا سب کچھ وہی ہے۔ نہ دنیا میں میرا کوئی اپنا ہے نہ دوست۔ عبدالولی میرا بھائی بھی ہے اور میرا دوست بھی۔ عبدالولی کبھی ایک سائیڈ پر بیٹھ جاتا تو کبھی دوسری سائیڈ پر۔ کبھی عمامہ کھول کر گود میں ٹوپی کے ساتھ رکھ دیتا یا پھر واپس باندھ لیتا۔ جب کبھی آنکھوں میں آنسو آجاتے تو چپکے سے اُسے عمامہ سے صاف کرلیتا۔ پھر وہ چپکے ڈرائیور کو دیکھتا کہ آنسو تو نہیں دیکھے۔ چمن سے کوئٹہ تک تین گھنٹوں کا سفر تین صدیاں لگنے لگی۔ عبدالولی سیٹ پر ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے ہوئے اپنے خیالوں میں اللہ داد کے ساتھ باتیں کررہا تھا کہ ڈرائیور نے کہا۔

مولوی صاحب! جیلانی ہسپتال پہنچ چکے ہیں۔

عبدالولی عمامہ او ٹوپی ہاتھ میں لیے نیم چپل پہنے گاڑی سے اُترا اور ہسپتال کی طرف دوڑنے لگا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مولوی صاحب! عمامہ سنبھالو۔ ڈرائیور نے پیچھے سے آواز دی۔ لیکن وہ ڈرائیور کی کہاں سُن رہا تھا۔ سیدھا پیچ ہسپتال کے شیشے کے کیبن یعنی استقبالیہ پر گیا۔ اُس کے بعد ہسپتال کے چوتھے فلور پر گیا۔ ایک کمرے کے سامنے ایک طالب کھڑا تھا۔ جیسے ہی عبدالولی پر نظر پڑی کہنے لگا۔

حافظ صاحب! اللہ داد اخوند اس کمرے میں ہے۔

کس کمرے میں ہے؟ کیسا ہے وہ؟ عبدالولی لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

اس کمرے میں، ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ طالب نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

عبدالولی نے جلدی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں دو طالبان اور ایک ڈاکٹر جو کہ اللہ داد کی نبض دیکھ رہا تھا آنکھیں بند تھیں، آنکھیں کھول دیں۔

آرام سے، انسان نہیں ہو کیا؟ ڈاکٹر نے عبدالولی سے کہا۔

عبدالولی جیسے اُس نے ڈاکٹر کی بات نہ سنی ہو اللہ داد کے قریب گیا۔ بیٹھے دو طالبان میں سے ایک بڑے طالب جو کہ لمبی داڑھی والا تھا عبدالولی سے گلے ملا۔

حافظ صاحب! اللہ داد اخوند ٹھیک ہے۔ ابھی آپریشن ہوا ہے تاحال ہوش میں نہیں ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ طالب نے ایک ہی سانس میں تمام حال بیان کیا۔

عبدالولی ہاتھ اُٹھائے نظر اللہ داد کے چہرے پر مرکوز کیے ہوئے حیران کھڑا تھا۔ طالب نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کمرے میں پڑی ایک کرسی پر بٹھادیا۔ لیکن عبدالولی کی نظریں اللہ داد کے چہرے سے نہیں ہٹ رہی تھیں اور نہ ہی وہ آنکھ جھپک رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اُس کی دونوں آنکھوں سے چھلک پڑے اور آہستہ سے چہرے پر بہہ کر داڑھی میں غائب ہو گئے۔ ایسے غائب ہوئے جیسے عبدالولی اور اللہ داد اس دنیا کے جنگل میں وقت کے جبر نے انہیں اپنوں سے جُدا کر کے غائب کیا تھا۔ پھر سر کرسی پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ طالب جس نے عبدالولی کو کرسی پر بٹھایا تھا نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

حافظ صاحب! کونسی چائے منگواؤں؟

عبدالولی نے اپنا سر کرسی سے اُٹھایا، اِدھر اُدھر دیکھا۔ڈاکٹر جا چکا تھا۔

چائے۔۔۔۔عبدالولی نے طالب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔جو تمھاری مرضی۔

اس طالب نے باہر کھڑے طالب سے کہا۔

جلدی جاؤ۔۔۔دودھ والی چائے اور پراٹھے لے آؤ۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۱۶)

چار دن گزر جانے کے بعد اللہ داد کو ہوش آ گیا۔ عبد الولی نے چارپائی کے نزدیک بیٹھا آہ سنی۔ جلدی سے اُٹھ کر اُس کے قریب کھڑا ہوا۔

اللہ داد اخوند! مم۔۔۔ میں ہوں۔۔۔۔ عبد الولی۔ عبد الولی نے اللہ داد کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اللہ داد سے کہا۔

اللہ داد نے آنکھیں کھول دیں، اِدھر اُدھر دیکھا۔ جیسے ہی عبد الولی پر اُس کی نظر پڑی تو ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ سر اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ عبد الولی نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

اٹھنا مت۔ عبد الولی نے کہا۔

اللہ داد نے سر واپس رکھ دیا۔ عبد الولی نے اُس پر چادر ٹھیک کی پھر اُس کے سرہانے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔ اللہ داد نے ضعیف آواز میں کہا۔

تم اس حال میں ہو اور میں نہ آؤں یہ ہو نہیں سکتا۔ تمھیں پتہ ہے کہ مجھ پر یہ تمام راتیں کیسی گزری ہیں، ایسے جیسے انگاروں پر کھڑا ہوں۔ عبد الولی نے شفیق بھائی کی طرح اُس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔

میں سمجھتا ہوں۔ ہم طالبان کا طالب کے سوا کوئی غم خوار نہیں۔ میرا تو کوئی بھی نہیں۔ اللہ داد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عبد الولی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ پھر اپنے کالے عمامہ سے پہلے اللہ داد کے پھر اپنے آنسو پونچھے۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم طالبان ہی ایک دوسرے کی مائیں بھی ہیں، بہنیں بھی اور بھائی بھی۔ تمھیں یاد ہے جب مجھے مدرسہ میں بخار ہوا تھا تو تم نے میرا سر اپنی گود میں رکھا۔ گیلا رکپڑا میرے ماتھے پر رکھتے۔ میری ماں نے یہ سلوک میرے ساتھ نہیں کیا۔ عبد الولی نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اور جو تم ماں، ماں پکار رہے تھے وہ؟ اللہ داد مسکرایا۔

ماں کی جگہ تم ماں بن کر کھڑے تھے۔ وہ جو مولوی صاحب سے چوری چھپے پیاز اور آلو کی یخنی بنا کر دی۔ عبد الولی نے کہا۔

اور کھائی بھی نہیں۔ وہ چوری بھی بڑے وہم میں کی تھی۔ دونوں ہنس پڑے۔ اسی اثنا کچھ ڈاکٹرز کمرے میں داخل ہو گئے۔

مولوی صاحب! کیسا ہے آپ کا مریض اب؟ ایک ڈاکٹر نے عبد الولی سے پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب! ابھی کچھ ہی دیر ہوئی ہے کہ ہوش میں آیا ہے۔ عبد الولی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا تھا کہ ٹھیک ہو جائے گا مگر تم بہت بے صبر ہو۔ ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

کیا کرتا، دل بے صبر تھا۔ عبد الولی نے کہا۔

میں نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ یہ تمھارا کون ہے۔ ڈاکٹر اللہ داد کے قریب گیا۔

دوست ہے میرا، بچپن کا دوست۔۔۔۔۔ سب کچھ ہے میرا۔ عبد الولی نے کہا۔

مولوی صاحب! آپ طالبان لوگوں کا بھی عجیب تعلق ہے ایسے ہو جیسے ایک باپ کی اولاد۔ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہو، میں نے کسی بھی طبقے میں اتنی محبت نہیں دیکھی جتنی تم لوگ ایک دوسرے سے کرتے ہو۔ ڈاکٹر نے اللہ داد کے زخم سے پٹی اُتارتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر صاحب! ہمارا ایک دوسرے کے سوا اور کوئی نہیں محبت کیلئے۔ سب کچھ یہی ہے۔ ہماری دنیا طالب سے شروع ہوتی ہے اور طالب پر ختم۔ نہ کوئی ہمیں خوشی میں شریک کرتا ہے نہ کوئی غم میں۔ غم اور خوشی میں صرف دُعا کیلئے بلاتے ہیں، دنیا نے ہماری ہر چیز سے آنکھیں پھیر لی ہیں، اسی لیے ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

ابھی تو آپ لوگوں کی بادشاہت ہے، پورا افغانستان آپ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

وہ بھی تو آپ لوگوں کی آنکھوں میں خیرہ ہے۔ عبد الولی نے کہا۔

ایسا کرو یہ زخم دھولو۔ ڈاکٹر نے نرس سے کہا۔ جب زخم صاف ہوا تو ڈاکٹر نے عبد الولی سے کہا۔ پریشان نہ ہوں بہت جلد آپ کا دوست ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر کچھ دوائیاں عبد الولی کو لکھ کر دی اور خود نکل گیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۱۷)

اللہ داد آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے جارہا تھا۔ اب اُس نے کھانا پینا بھی شروع کیا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ ایک ہفتے بعد اُسے ہسپتال سے رخصت کیا جائے گا۔ عبدالولی نے باقی طالبان کو رخصت کیا تھا اور خود اللہ داد کے ساتھ تھا۔

عبدالولی ہر روز عصر کی نماز کے بعد ہسپتال کے باہر ایک میڈیکل سٹور کے ساتھ تھڑے پر چادر بچھائے بیٹھا مغرب تک سڑک کا نظارہ کرتا اور ایک کپ دودھ پتی چائے بھی پیتا۔ اس میڈیکل سٹور میں ہر روز ایک آدمی اُس سے پہلے آتا۔ میڈیکل سٹور میں کرسی پر بیٹھے پیٹھ پیچھے کرکے میڈیکل کے مالک سے گپ شپ کرتا۔ عبدالولی اُن کی باتیں سنتا۔ وہ لوگ ہمیشہ سیاست پر بات کرتے۔ کبھی کبھی پشتونوں کے حالات، اُن کی بے سوادگی پر بھی تبصرہ کرتے۔ عبدالولی کبھی اُن کی باتوں پر دھیان دیتا تو کبھی سڑک پر۔ مغرب کی آذان کے ساتھ کھڑا ہو جاتا۔ مگر وہ دونوں وہیں میڈیکل میں بیٹھے رہتے۔

ایک دن جب اللہ داد سو گیا تو وہ کمرے سے باہر نکلا، پھر اپنی جگہ پر چادر بچھا کر بیٹھ گیا۔ میڈیکل سٹور کی طرف جب دیکھا تو وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ کچھ فاصلے پر وہ دونوں تھڑے پر ٹیبل کے سامنے بیٹھے تھے اور سامنے چائے بھی پڑی تھی۔ دونوں معمول کے مطابق بحث کر رہے تھے۔ آج عبدالولی اُن کی گفتگو صاف سن رہا تھا۔ وہ شخص جو میڈیکل میں پیٹھ دکھائے بیٹھا تھا کہہ رہا تھا۔

یہ صرف جاہل ہیں جاہل اور بس۔

یوں بھی نہیں ہے جیسے تم کہہ رہے ہو۔ دراصل تم ہر چیز کو این جی او کی نظر سے دیکھتے ہو۔ میڈیکل کے مالک نے کہا۔

عبدالولی کا دھیان اُن کی گفتگو کی طرف گیا۔ اُن کو غور سے دیکھا وہ شخص جس کی پیٹھ میڈیکل میں ہمیشہ اِس کے طرف ہوتی اُس کا چہرہ دیکھا، غور سے دیکھا۔ ایسے اُچھلا جیسے سانپ نے ڈسا ہو۔ جس شخص کو اُس نے دیکھا وہ اس کا چچازاد بھائی سلیم تھا۔ اگرچہ سلیم پہلے سے کچھ موٹا

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہو چکا تھا، سر کے بال بھی گر چکے تھے اور خدوخال میں بھی فرق آیا تھا کلین شیو کرتا تھا اس لیے اُسے پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اگر اُس کی مونچھ داڑھی ہوتی تو شاید نا پہچانا جاتا۔

میں کسی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ خدا نے مجھے عقل اور شعور دیا ہے۔ اپنے شعور کے تناظر میں انہیں دیکھتا ہو۔ سلیم نے دوسرے شخص کو جواب دیا۔

عبدالولی نے چادر اُٹھا کر اپنے سر پر ڈالی اور اُن کی طرف سے مُنہ پھیر دیا اور اُن کی باتیں سننے لگا۔

یہ ہمارے معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو محروم رہ گیا ہے۔ ان کی تربیت ایک خاص بند ماحول میں ہوئی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اُنہیں اپنے سے الگ کریں ہمیں چاہیئے کہ ہم اُنہیں اپنا جانے۔ یہ ہمارے بھائی ہیں۔۔۔۔۔۔

اس سے پہلے کہ شخص بات پوری کرتا سلیم نے اُس کی بات کاٹ لی۔

یار حسن صاحب! تم بھی عجیب شخص ہو، اگر تمھارے جیسا پڑھا لکھا، سیاسی شعور رکھنے والا علاقائی رسم ورواج کو سمجھنے والا، جدید ذہن رکھنے والے لوگ بھی یہ سوچنے لگیں تو ایک عام اور ان پڑھ شخص سے کیا گلہ۔ ان طالبان کا مقصد یہی ہے کہ ہمیں ترقی سے روکے۔ یہ رجعت پسند ہمیں دنیا کی برابری سے روکیں۔ تم نے ان کی چہروں کو دیکھا ہے۔ لمبے بال، بڑی داڑھیاں، انسانیت سے دُور۔ سلیم نے نفرت سے مُنہ کو بگاڑا۔ مذہب میرا اپنا کام ہے، میں اُس پر عمل کرتا ہوں یا نہیں۔ یہ لوگ بندوق کی زور پر لوگوں سے کرواتے ہیں۔ پشتون قوم کو پتھر کے زمانے میں لے کر گئے ہیں۔ سلیم نے اپنی بات پوری کی۔

سلیم خان! تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر پشتونوں کی بات کی جائے تو اُس میں، میں اور تم بھی شریک ہیں۔ تم جن لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہو یا تمھارے جیسے اور نوجوان جو تعلیم یافتہ ہیں ہر چیز سے باخبر ہیں اور سمجھ رہے ہیں ان تنظیموں کے ساتھ کام کر رہے ہیں میرا مطلب این جی اوز سے ہے، یہ پڑھے لکھے نوجوان جو قوم کا سرمایہ ہیں سمجھتے ہیں کہ پشتونوں کو ترقی کی راہ پر گامزن

(c) ketabton.com: The Digital Library

کر رہے ہیں مگر یہ پشتونوں کو بیگانگی کی راہ پر لے جانا چاہتے ہیں۔ معذرت کے ساتھ، جن لوگوں کی تربیت این جی اوز کے سایہ تلے ہوئی ہے وہ لوگ بھی انتہا کو پہنچے ہیں۔ جو طالب تمھیں انتہا پر دکھائی دے رہا ہے اُس کے دوسرے سرے پر تمھارے جیسے لوگ ہیں۔ تم عورتوں کی آزادی کی بات کرتے ہو؟ شخص نے سلیم سے پوچھا۔

ہم صرف عورتوں کی آزادی کی بات نہیں کر رہے، ہم چاہتے ہیں کہ قوم کو مذہب کے افیم سے نجات دلائیں۔ مذہب تو افیم کی طرح نشے میں مبتلا کرتا ہے۔ پھر اُن کی عقل کام نہیں کرتی جیسے ہمارے دوست۔ سلیم نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

عورتوں کی آزادی سے تمھارا کیا مطلب ہے؟ حسن نے اپنا سوال پھر دھرایا۔

عورتوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزاریں جیسے کہ مرد کو معاشرے میں جتنی آزادی حاصل ہے اُتنی آزادی عورتوں کو بھی حاصل ہو۔ معاشرے میں وہ آگے بڑھے تاکہ ملک کی ترقی میں حصہ ڈال سکیں۔ ایسا نہیں کہ اُسے اپنے گھر میں قید کریں یا پھر بڑے بڑے برقعے پہنائے جائیں جیسے قفس پر پردہ ڈالا جائے۔ سلیم نے واضح الفاظ میں کہا۔

تم نے اپنے گھر میں اس آزادی کا کتنا خیال رکھا ہے۔ تمھاری ماں، بیوی اور بہن کو یہ آزادی حاصل ہے۔ جس آزادی کی تم مانگ کر رہے ہو؟ حسن نے پھر سوال کیا۔

یہ آزادی میں اُس وقت دونگا جب پورے ملک میں آزادی آجائے۔ میں اکیلے یہ کام کیسے کر سکتا ہوں۔ سلیم نے جواب دیا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی تک تم نے اپنے اوپر یہ چیز لاگو نہیں کی اور نہ ہی عملی جامہ پہنایا ہے۔ صرف باتوں کی حد تک اس آزادی کے قائل ہو۔ تم پہلے دوسرے کی عورتوں کیلئے آزادی چاہتے ہو پھر اپنے عورتوں کو آزادی دو گے۔ یہ بات بہت خطرناک ہے، اس طرح کا نقطہ نظر معاشرے کو انتشار کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر کوئی تبدیلی لانا چاہتا ہے تو اس کے قول اور فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیئے۔ میں جتنا بھی طالبان کے خلاف بات کروں مگر یہ بات مانتا ہوں جو

(c) ketabton.com: The Digital Library

اُنہوں نے کہا ہے اس پر عمل بھی کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بات ٹھیک ہے یا غلط۔ حسن نے کہا۔

یہ تمھاری سوچ ہے کہ اُن کے قول او فعل میں تضاد نہیں۔ ان میں جو مقتدر طبقہ ہے وہ مختلف شکلوں میں جتنا استحصال کر رہا ہے وہ میں اور تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ مولوی اپنے بیٹوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور میرے اور تمھارے بیٹوں کو جہاد پر بھیجتے ہیں۔ مذہب کے نام پر نوخیز نوجوانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ سلیم نے اعتماد سے کہا۔

یہ تضاد موجود ہے مانتا ہوں۔ مگر یہ تضاد ہر طبقے میں موجود ہے۔ میں دوسری جگہ کی بات نہیں کرتا، تمھاری مثال لیتے ہیں۔ تمھیں کتنا عرصہ ہوا ہے اس این جی او میں کام کرتے ہوئے۔ پانچ چھ سالوں سے زیادہ ہو رہا ہے۔ بقول تمھارے کہ تمھاری این جی او لیٹریسی (Literacy) تعلیم او صحت پر کام کر رہی ہے۔ تم کہتے ہو کہ یہ کام بطور خدمت کر رہا ہوں، ایسا ہی ہے نا؟ حسن نے سلیم سے تصدیق مانگی۔

ہاں۔ اس میں کوئی شک ہے۔ سلیم نے کہا۔

تمھاری تنخواہ کتنی ہے؟ سلیم نے پوچھا۔

پچاس ہزار سے زیادہ ہے۔ سلیم نے جواب دیا۔

تم یہ خدمت پچاس ہزار روپوں کی عوض کر رہے ہو۔ اگر خدمت کی بات چھوڑ دی جائے تو تم یہ بتا سکتے ہو کہ تمھارے گاؤں میں تمھارے گھر کے ساتھ کتنے بچے ہیں جو بے تعلیم ہیں یا پھر تم نے اُن کی کتنی مدد کی ہے۔ کتنی عورتیں ہیں جو بیماری کے باعث صحت کی سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے مر رہی ہیں۔ تم نے ان کی کتنی خدمت کی ہے۔ اس مد میں کروڑوں کے بجٹ آپ لوگوں کے پاس آتے ہیں وہ تم لوگوں کی تنخواہ، پیٹرول اور دفتروں پر خرچ ہوتے ہیں۔ تم جس گاڑی میں گھومتے ہو اس کے ایک دن کا خرچہ کسی غریب گھرانے کے ایک مہینے کا خرچ ہے۔ اس طرف تم لوگ کیوں دھیان نہیں دیتے۔ حسن نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

تم تو پورے طالب ہو۔ ویسے ہی تم نے اپنے آپ سے قوم کا غمخوار بنایا ہے۔ سلیم نے معقول جواب دینے کے بجائے ذاتی وار کیا۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ جب تمھیں تمھاری خرابی کی نشاندہی کرائی گئی تو میں تمھاری نظر میں طالب بن گیا۔ اگر طالب کو اُس کی خامی بتائی جائے تو کافر بن جاتا ہوں۔ ہم اپنا نقطہ نظر اور عمل کو ہر تنقید سے بڑھ کر دیکھتے ہیں۔ اپنے گریبان میں اپنی خامیاں نہیں دیکھتے، اگر کوئی اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے تو وہ ہمارا دشمن ہے۔ بحیثیت ایک قوم کے یہ ہمارا مجموعی رویہ بن گیا ہے۔ حسن نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

ارے جگر! مغرب اتنا پاگل نہیں جو ہمیں مفت پیسے دے رہا ہے۔ ٹکے ٹکے کا حساب دیتے ہیں۔ سلیم نے کہا۔

میں مانتا ہوں تم حساب دیتے ہو، مگر یہ حساب صرف فائلوں اور کاغذوں تک محدود رہتا ہے۔ مغرب چاہتا بھی یہی ہے کہ ہمارے بااستعداد نوجوان نسل کو اسی طرح کی سرگرمیوں میں مصروف رکھا جائے۔ اور نوجوان سمجھتے ہیں کہ ہم ایک بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔ انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں اور قوم کو شعور دے رہے ہیں، نفع دے رہے ہیں۔ لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو اس کے اثرات کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ تم کہتے ہو کہ تمھارا سگا چچازاد بھائی عرصے سے طالبان میں ہے پھر اُس کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ زندہ ہے یا پھر مر گیا۔

عبدالولی نے جلدی کان سے چادر ہٹائی تاکہ بات ٹھیک سے سُن سکے۔

اُس کے بھائی بہن، ماں باپ کس حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں تم نے کوئی مدد کی ہے۔ جان پہچان ہے، اچھی پوزیشن ہے، پیسے ہیں تمھارے پاس، تمھاری اور اُن کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمھاری شادی میں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمھارے چچا اور چچازاد بھائی ایسے کام کر رہے تھے جیسے وہ تم لوگوں کے نوکر ہوں۔ تم اُنہیں کس نظر سے دیکھ رہے تھے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

یہ سُنتے ہی عبدالولی نے جسم میں ایک کپکپی سی محسوس کی۔ اُس کا دل چاہا کہ اُٹھ کر سلیم کو گریبان سے پکڑ کر ہر چیز کا حساب لے۔ کانوں میں ایک گونج سی پھیل گئی۔ تمام گھرانہ اُس کے نظروں کے سامنے آگیا۔ کچھ سوچے بغیر دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ آج سلیم کو گریبان سے پکڑوں گا اور اُن تمام چیزوں کا حساب لونگا۔

عبدالولی جیسے ہی کھڑا ہوا ایک سراچہ گاڑی تیزی سے آئی۔ سلیم اور حسن کے قریب بریک لگائی۔ دو آدمی نقاب پہنے گاڑی سے اُترے۔ ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف اور دوسرے کے ہاتھ میں ٹی ٹی پستول تھا۔ آنکھ جھپکتے ہی سلیم کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔ یہ اتنی جلدی ہوا کہ کسی کو کچھ کرنے کا کیا کچھ سوچنے تک کا موقع نہ ملا۔

حسن جلدی سے بھاگ کر میڈیکل کے اندر گیا اور ٹیلیفون کا رسیور اُٹھایا، شاید وہ پولیس کو خبر کر رہا تھا۔ عبدالولی کو یہ سب خواب کی طرح لگا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ جس ارادے سے اُٹھا تھا اُسی طرح کھڑا رہ گیا۔ قریب کھڑے لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ یہ کیا ہوا۔ لیکن کسی نے بھی کچھ نہیں کیا اور نہ وہ کرسکتے تھے اور نہ کسی کے بس میں تھا۔

عبدالولی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ایک دفعہ وہ نیچے چورنگی تک گیا پھر واپس ہسپتال کی طرف آیا۔ یہاں پہنچ کر وہ کچھ سنبھل گیا تھا۔ اللہ داد بھی جاگ چکا تھا۔

حافظ صاحب! خیر ہے آج مغرب کی نماز سے پہلے آ گئے؟ اللہ داد نے پوچھا۔

دن دھاڑے، لوگوں کی موجودگی میں لوگ آکر آدمی کو گاڑی میں زبردستی ڈال کر لے جاتے ہیں۔ روکنے والا کوئی نہیں۔ یہ کوئی حکومت ہے جو دنیا کو بھی قبول ہے اور لوگوں کو بھی۔ وہاں کوئی ایسی حرکت کرے پتہ چل جائے گا کہ اُن کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ عبدالولی نے کہا۔

کیوں کیا ہوا، کس کو گاڑی میں ڈالا؟ اللہ داد نے پوچھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مجھے کیا پتہ کون تھا۔ عبد الولی نے ٹیبل کے ساتھ پڑے گلاس کو اُٹھایا اور پانی سے بھر کر پینے لگا۔ پھر اپنے پسینے پھونچھنے لگا۔

دوسرے دن شام کو عبد الولی اُس میڈیکل میں گیا جہاں سلیم بیٹھا کرتا تھا۔ عبد الولی نے میڈیکل کے مالک حسن سے پوچھا۔

کل وہ شخص کون تھا جسے اُٹھا کر لے گئے؟ میں یہاں چائے پی رہا تھا تو یہ سب دیکھا۔

اور کون ہیں، اغوا کار ہیں۔ تاوان کیلئے اُٹھایا گیا ہے۔ اس بیچارے نے کچھ عرصے پہلے سے کچھ پیسے کمائے ہیں وہ بھی این جی او میں اور گاڑی بھی ساتھ ہے۔ اپنی بھی ایک اچھی گاڑی ہے، اسی لیے اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ حسن نے جواب دیا۔

کوئی حال احوال ہے یا نہیں۔ آپ کا کیا لگتا ہے؟ عبد الولی نے پوچھا۔

ہاں اُس کے والد نے کہا کہ انہوں نے ایک کروڑ کا مطالبہ کیا ہے۔ پیسے ضرور ہیں مگر کروڑوں میں نہیں۔ حسن نے کہا۔

آپ کا کیا لگتا ہے۔ عبد الولی نے پھر پوچھا۔

میرے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ دوست ہے میرا۔ حسن نے جواب دیا۔

اچھا، اللہ دیکھے اُن کو۔ عبد الولی نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

ہاں آمین، چھوٹے بچے ہیں اُس کے، خدا حفاظت کرے۔ حسن نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۱۸)

آج جب ڈاکٹر اللہ داد کے پاس آئے اُس کے زخموں کو چیک کیا تو کہا۔

طالب جان! لو بھئی خدا کا شکر ہے کہ آپ اب بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کل اگر خدا نے چاہا تو آپ کو رخصت کریں گے۔ زخم سارے ٹھیک ہو گئے ہیں۔

اللہ داد بھی مطمئن تھا کہ وہ اب بہت حد تک ٹھیک ہے۔ ڈاکٹروں سے کہا۔

یہ آپ لوگوں کے ہاتھوں میں شفاء ہے اور خدا کی مدد۔ ورنہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ زندگی کی شمع گُل ہونے کو ہے۔ شاید اللہ کو کچھ اور منظور ہو۔

کوشش کرو کہ کچھ دن گھر پر آرام کرو۔ دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔

ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔ اللہ داد نے جواب دیا۔

یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ نے اجازت دے دی، بہت دن ہو گئے ہیں، اب ہمیں چاہیئے کہ جلدی سے اپنی اوطاق پہنچ جائیں، عبدالولی نے کہا۔

جب ڈاکٹر چلے گئے تو اللہ داد نے عبدالولی سے کہا۔

میرے ذہن میں ایک اور خیال نے جنم لیا ہے، ڈاکٹروں نے بھی کہا کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ اگر یہ چند دن تمھارے گھر میں گزار دوں تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس سے پہلے کہ اللہ داد اپنی بات پوری کرتا عبدالولی نے غصے سے کہا۔

کونسا گھر، کس گھر کی بات کر رہے ہو۔ اللہ داد اخوند یہ باتیں چھوڑو، آرام اوطاق میں کر لینا۔ اب بہت وقت ہو چکا ہے، وہاں بہت سے کام پڑے ہیں۔ میں گاڑی منگواتا ہوں جو ہمیں سیدھا سپین بولدک (بارڈر) لے جائے۔ وہاں سے محمد گل اخوند کے ساتھ جائینگے۔ میں اُس کو فون کرتا ہوں۔ عبدالولی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

حافظ صاحب! تمھیں تو پتہ ہے کہ میرا کوئی نہیں۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی۔ بھائی کی کمی تو تم نے پوری کی، ماں کو دیکھنے کی حسرت ہے کہ یہ ماں ہوتی کیسی ہے۔ میں تو ماں سے اُس وقت

(c) ketabton.com: The Digital Library

بچھڑا ہوں جب یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھاری ماں کو دیکھ لوں اور ماں کہہ کر پکاروں۔ اللہ داد نے عبدالولی کی ماں کو دیکھنے کی آرزو کی۔

ماں کے نام پر عبدالولی بھی یوں تڑپا جیسے اُسے سانپ نے ڈسا ہو۔ چہرے پر کرب کے اثرات نمایاں ظاہر تھے۔

اللہ داد اخوند! کیوں میرے زخموں پر نمک چھڑکتے ہو، اچھی طرح پتہ ہے کہ میں نے یہ باب ہمیشہ کیلئے بند کر دیا ہے پھر کیوں تنگ کر رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عبدالولی نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

اس باب کو بند کرنا تمھارے بس کی بات نہیں اور نہ ہی یہ تمھارا حق ہے کہ اس کو بند کر سکو۔ اللہ اُن لوگوں کو پسند نہیں فرماتا جو صلہ رحمی کو قطع کرتا ہے۔ اللہ داد نے کہا۔

اللہ داد اخوند! تم تو میرے دل کے حال سے واقف ہو، اگرچہ میرے مُنہ سے نہیں نکلا۔ اُس کے باوجود تمھیں پتہ ہے کہ میں ہر رات کتنے کرب سے گزرتا ہوں۔ سب کچھ ہے۔ ماں ، باپ، بہن، بھائی۔ مگر اللہ نے اُن کے ساتھ میرا نصیب کم کر دیا۔ ایسی رات نہیں ہو گی جو میں نے ماں کو یاد کیے بغیر گزاری ہو۔ خیالوں میں اُس کی گود میں سر رکھ کر سو جاتا ہوں۔ مگر کیا کروں جتنا ملنے کی کوشش کرتا ہوں اُتنی شدت سے کوئی دوسری قوت مجھے ملنے سے روک دیتی ہے۔ عبدالولی نے اپنی بے بسی کا اظہار کر ہی دیا۔

آج اس دوسری قوت کو دونوں شکست دینگے اور اپنی ماں کے قدموں کو چوم لینگے۔ اللہ داد نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو اللہ داد اخوند! دونوں اُس کے پاس جائیں گے مگر اب نہیں۔ ایک دفعہ اپنی اوطاق چلے جائیں اُس کے بعد اگر خدا نے چاہا گھر جائینگے۔ عبدالولی نے کہا۔

اوطاق کو کیا آگ لگی ہے، صرف دو دنوں کی ہی تو بات ہے، انہیں بھی تسلی ہو جائے گی پھر ہم بھی چلے جائینگے، دوسری مرتبہ پھر آجائینگے۔ اللہ داد نے اپنی بات پر زور دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مجھے والی صاحب نے احوال بھیجا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے آ جاؤ۔ میں یہاں اور نہیں ٹھہر سکتا، انشاءاللہ جیسے ہی پہنچ جائیں تو آنے کا پروگرام بنا لیتے ہیں۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ ضرور آئیں گے۔ عبدالولی نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

چلو یہی صحیح، جب تم ہی نہیں چاہتے کہ مجھے ماں کی دعائیں نصیب ہو تو پھر ٹھیک ہے میری قسمت میں نہیں کہ کسی کو ماں کہہ سکوں۔ خدا بھی مجھ سے حساب کرے گا، دامن دیا ہے مگر وہ بھی خالی۔ ہر چیز سے خالی۔ اللہ داد نے بہت ہی مایوس کن لہجے میں کہا۔

اللہ داد اخوند! اللہ داد اخوند! کہاں نا کہ واپس آ جائیں گے، کیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ مجھ میں اور تم میں کیا فرق ہے۔ تمھارا تو کچھ نہیں لیکن میرا سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں۔ ساری زندگی تمھارے ساتھ ایک یتیم کی طرح گزاری۔۔۔۔ آئینگے اگر خدا نے چاہا۔ عبدالولی نے اللہ داد کو تسلی دی۔

عبدالولی اخوند! میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ پتہ نہیں یہ زندگی کب تک وفا کرے گی۔ جیسے تم چاہتے ہو وہی کرو میں کچھ نہیں بولوں گا۔ اللہ داد نے اُسی لہجے میں کہا۔

اگلی صبح دونوں ہسپتال کے سامنے کھڑی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بارہ بجے وہ سپین بولدک کے اڈے پر اترے۔ محمد گل تین طالبان کے ساتھ اُن کے انتظار میں تھا۔ پھر دونوں اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے اور اپنی اوطاق کے طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں محمد گل نے بتایا کہ والی صاحب نے کہا ہے کہ پہلے آپ لوگوں کو اُن کی طرف لے جاؤں اُس کے بعد اپنی ذمہ داری کی طرف چلے جانا۔ انہوں نے بھی بات مان لی۔ ظہر کی نماز والی صاحب کے دفتر میں پڑھی۔ کھانا بھی وہیں کھایا۔ قہوہ چائے اُن کے سامنے رکھی گئی تھی کہ والی صاحب تشریف لائے۔

السلام علیکم! خوش آمدید اللہ داد اخوند۔ بہت خوشی ہوئی، آپ کو بہ روح صحت دیکھا۔ اللہ آپ کو صحت مبارک کرے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

وعلیکم السلام! بہت مہربانی۔ اللہ آپ کا ایمان تازہ کرے۔ دونوں نے ایک ہی جملے میں کہا۔

والی صاحب یہ آپ کی دعاؤں کی برکت ہے کہ موت کے مُنہ سے نکل آیا ہوں۔ اللہ داد نے کہا۔

یہ اللہ کا فضل ہے اللہ داد اخوند۔ اللہ مجاہدین کی مدد ہر وقت ہر جگہ کرتا ہے۔ والی صاحب نے جواب دیا۔

بے شک۔ عبدالولی نے کہا۔

حافظ صاحب! آپ کیسے ہیں۔ والی صاحب نے عبدالولی سے حال احوال دریافت کیا۔

الحمد اللہ میں ٹھیک ہوں۔ میرا دوست ٹھیک ہو گیا تو پھر میں تو بہت ہی ٹھیک ہوں۔ عبدالولی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

ملک کے حالت دوسری طرف جارہے ہیں، میں نے آپ لوگوں کو اس لیے بلایا کہ حالات سے باخبر کردوں۔ یہ باتیں کھلم کھلا نہیں کہی جاسکتی۔ والی نے عبدالولی سے کہا۔

کیوں کیا ہوا؟ ہم تو اس امید پر تھے کہ بہت جلد سارا افغانستان ہمارے قبضے میں ہو گا۔ عبدالولی نے کہا۔

مگر اب ایسا لگ رہا ہے کہ قبضہ کیا ہوا افغانستان بھی ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ والی نے جواب دیا۔

وہ کیوں؟ عبدالولی تشویش میں پڑ گیا۔

امریکہ پر جو حملہ ہوا ہے، امریکہ کا کہنا ہے کہ اس حملے میں شیخ صاحب کا ہاتھ ہے۔ اُن کی مانگ ہے کہ شیخ صاحب کو اُن کے حوالے کیا جائے یا پھر جنگ کیلئے تیار ہو جائیں۔ والی صاحب نے مختصراً اُن کو بتایا۔

کونسا حملہ، یہ کیسی بات ہے؟ عبدالولی نے بے خبری میں کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

حافظ صاحب! آپ بھی بادشاہ ہو۔ کسی چیز کی خبر نہیں رکھتے یہ باتیں تو پوری دنیا میں ہو رہی ہیں۔ میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ آپ مجھ سے ہمیشہ رابطے میں رہیں گے۔ حالات بہت جلد تبدیل ہونے والے ہیں اور ہمیں حالات کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنا ہو گا۔ والی صاحب نے عبدالولی سے کہا۔

والی صاحب! یہ بات مجھے مایوس کن لگ رہی ہے میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ لوگ۔۔۔۔۔

یہ مایوسی نہیں، بہت جلد آپ سمجھ جاؤ گے۔ والی صاحب نے عبدالولی کی بات کاٹی۔

اب آپ لوگ اپنے ضلع میں جائیں، دوسرے لوگوں یا پھر اپنے ساتھیوں سے ان باتوں کا تذکرہ کرنا ضروری نہیں۔ یہ باتیں صرف آپ لوگوں تک محدود رہنی چاہیئے۔ میں آپ کو قابل اعتماد شخص سمجھتا ہوں۔ والی صاحب نے یہ کہہ کر دونوں کو رخصت کیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۱۹)

عبدالولی واپس اپنے معمول کی زندگی پر آگیا۔ اب وہ ایک ریڈیو بھی ساتھ رکھنے لگا جس سے وہ خبریں سنتا اور خود کو حالات سے باخبر رکھتا۔ والی صاحب کے ساتھ بھی رابطے میں تھا۔ کبھی کبھار وائرلیس پر رابطہ کرتا۔ اللہ داد اوطاق میں تھا۔ کبھی کبھار وہ بھی ان کے ساتھ گشت پر نکل جاتا۔ لیکن زیادہ تر وقت اوطاق میں گزارتا۔ عبدالولی اگرچہ اپنے معمولات جاری رکھے ہوئے تھا لیکن حالات کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس پریشانی پر اتنی فکر نہ تھی جتنی گھر کی فکر تھی۔ سلیم کو دیکھنے کے بعد تو اور اضطراب میں مبتلا ہو چکا تھا۔ دل میں سلیم سے بدلہ لینے کی حسرت اُسی طرح رہ گئی تھی۔ نیند بھی کم ہو گئی تھی۔ جب بھی سوتا وہ دو خواب اکثر دیکھتا۔

خواب میں سینے کی روشنی بالکل کم ہو گئی تھی۔ اژدھا کی خوراک بھی بڑھ گئی تھی۔ آج بھی وہ صبح گشت پر نکلا، شہر کی گلیوں میں گشت کیا۔ زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ کوئی ایسی چیز اُس کی نظر سے نہیں گزری جس سے اُسے اندازہ ہو کہ وہ بُری ہے۔ لیکن اردگرد کی فضاء غمزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ ہر شخص اُسے غمزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اگر کوئی ہنس بھی رہا ہوتا تو اُسے لگتا کہ وہ رو رہا ہے۔ ریڈیو کی خبروں سے اُسے اندازہ ہو رہا تھا۔ جس اژدھا کو وہ کئی عرصے سے خواب میں دیکھ رہا تھا حقیقت میں آہستہ آہستہ اس وطن کی طرف بڑھ رہا ہے اور وطن کے تمام بچوں کو نگل رہا ہے۔ خواب میں اُس پر اتنے گہرے اثرات مرتب کیے تھے کہ اب وہ کبھی کبھی کھلی آنکھوں اُس اژدھا کو دیکھتا۔

جب وہ واپس اوطاق کی طرف روانہ ہوا تو محمد گل نے کہا۔

حافظ صاحب! کئی دنوں سے جمعہ خان کی گلی کے ایک گھر میں کچھ مشکوک افراد نظر آرہے ہیں۔ میں نے کئی بار انہیں گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔ خدوخال اور کپڑوں سے تو طالبان نظر آتے ہیں لیکن مجھے طالبان نہیں لگتے۔ میں نے حال احوال معلوم کیا ہے مگر انہیں کوئی نہیں پہچانتا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

تمھیں انہی سے پوچھنا چاہیئے تھا۔ اگر طالبان ہیں تو پھر وہاں کیوں رہ رہے ہیں۔ عبدالولی نے کہا۔

میں نے اُن سے اس لیے پوچھ گچھ نہیں کی کہ ہو سکتا ہے وہ ضلع امیر کی طرف سے یہاں آئے ہوں اور آپ بھی موجود نہ تھے اس لیے۔ محمد گل نے کہا۔

مجھے تو کافی دن ہوئے آیا ہوں، پھر مجھ سے کیوں نہیں کہا۔ ضلع امیر اگر کسی کو بھیجے گا تو پہلے ہم سے بات کرے گا۔ ادارے کو اس طرح کی اطلاع نہیں آئی کہ یہ طالبان ہیں یا پھر کوئی اور ؟ عبدالولی نے پوچھا۔

نہیں ایسی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ میں ہر روز ادارے کے دفتر جاتا رہا ہوں۔ محمد گل نے کہا۔

ٹھیک ہے عصر کی نماز کے بعد چلتے ہیں۔ تمھیں تو گھر معلوم ہے؟ عبدالولی نے محمد گل سے پوچھا۔

ہاں گھر مجھے معلوم ہے۔ محمد گل نے جواب دیا۔

سہ پہر کو عبدالولی اللہ داد کو بھی ساتھ گشت پر لے کر نکل گیا۔ عبدالولی کے ذہن میں حالات کی وجہ سے بہت سے شکوک پیدا ہوئے تھے۔ بہت سے ایسے لوگ پکڑے جا چکے تھے جو طالبان کی بھیس میں آئے تھے للیکن مقصد اُن کا کچھ اور تھا۔ ان لوگوں کے بارے میں جو محمد گل نے کہا تھا پریشان تھا۔ ایسا نہ ہو جو حالات ملک میں پھیل رہے ہیں یہ لوگ بھی اُس مقصد کیلئے آئے ہوں۔ اسی سوچ میں تمام شہر کا گشت کر لیا۔ عصر کی نماز جمعہ خان کی گلی کے قریبی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد مسجد کے باہر کچھ لوگ عبدالولی سے ملنے آئے۔

حافظ صاحب! بڑے عرصے کے بعد اس طرف آنا ہوا آپ کا۔ ادارے کی گاڑی تو کبھی کبھار اس طرف آجاتی ہے۔ ایک شخص نے پوچھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہاں، کچھ مصروفیات تھیں اس لیے عرصہ ہوا یہاں نہیں آیا۔ خیر اب میں آ گیا ہوں۔ میرے ساتھی آتے تھے تو یوں سمجھیں جیسے میں خود آ رہا تھا۔ عبدالولی نے کہا۔

ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔ اُسی شخص نے کہا۔

کیسے ہو، زندگی کیسی گزر رہی ہے، کوئی مسئلہ تو نہیں۔ عبدالولی نے پوچھا۔

نہیں، واللہ کوئی مسئلہ نہیں، صبح ہو جاتی ہے، پھر شام، نہ بجلی ہے نہ کوئی اور چیز، نہ کوئی چور ہے۔ امن و امان ہے اور بس یہی زندگی ہے۔ ایک بوڑھے شخص نے کہا۔

حاجی صاحب! دو دن کی زندگی ہے گزر جائے گی، بجلی ہو یا نہ ہو۔ خدا ہماری آخرت سلامت رکھے۔ عبدالولی نے کہا۔

پھر ساتھیوں سمیت اُن سے رخصت لی۔ جمعہ خان کی گلی میں داخل ہوئے اور سیدھا اُس گھر کے سامنے رُکے جس کے بارے میں انہیں شک تھا کہ یہاں مشکوک لوگ طالبان کی بھیس میں رہ رہے ہیں۔ عبدالولی اور اللہ داد گاڑی میں بیٹھے رہے۔ محمد گل اور دوسرے طالبان کو معلومات کیلئے بھیجا۔

کچھ دیر بعد محمد گل ایک شخص کے ساتھ ان کے پاس آیا۔

حافظ صاحب! یہ ہے وہ شخص۔ یہ اپنے آپ کو طالبان کہتے ہیں۔ محمد گل نے کہا۔

کہاں سے آئے ہو؟ عبدالولی نے شخص سے پوچھا۔

ہم کوئٹہ سے آئے ہیں۔ شخص نے جواب دیا۔

کتنے آدمی ہو اور کس مقصد کیلئے آئے ہو؟ عبدالولی نے پوچھا۔

چار آدمی ہیں ہم، طالبان کیلئے آئے ہیں۔ شخص نے جواب دیا۔

طالبان ہو یا پھر طالبان کی طرح دکھتے ہو؟ عبدالولی نے شکی لہجے میں پوچھا۔

ہم طالبان ہیں صاحب جہاد کیلئے آئے ہیں۔ شخص نے ڈرتے ہوئے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ضلعی دفتر میں نام لکھوائے ہیں یا پھر کسی دوسرے حکومتی شخص سے ملے ہو؟ عبدالولی نے اپنے سوالات جاری رکھے۔

نہیں صاحب۔ یہاں ایک گھر کرائے پر لیا ہے۔ ضلع دفتر بھی چلے جائینگے۔ شخص نے جواب دیا۔

عبدالولی کا شک آہستہ آہستہ یقین میں بدل رہا تھا۔ جب جہاد کیلئے آئے ہو تو پھر گھر کیوں کرائے پر لیا ہے۔ عبدالولی نے غصے میں کہا۔

وہ جناب ایک خاتون بھی ساتھ ہے۔۔۔۔۔۔۔

کیا کیا کیا؟ عبدالولی نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور نیچے اُتر آیا۔

خاتون ساتھ ہے؟ کس لیے؟ اُسے بھی جہاد کیلئے لائے ہو؟ عبدالولی نے شخص کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نہیں، نہیں بہن ہے میری۔ وہ وہاں اکیلی تھی اس لیے ساتھ لایا ہو۔ شخص کا جھوٹ صاف نظر آرہا تھا۔

اللہ داد اخوند! چلیں اس شخص کے بہن کو دیکھتے ہیں۔ اور اُن دوسرے طالبان سے بھی مل لیتے ہیں جو اس نیک کام کیلئے آئے ہیں۔ عبدالولی نے اللہ داد سے کہا۔

اللہ داد بھی گاڑی اُترا اور سب گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ جب گھر کے قریب ہوئے تو دو طالبان نے ایک شخص کو گریبان سے پکڑا تھا، تیسرا طالب گھر کے دروازے میں کھڑا تھا۔

مجاہد تو بھاگتے نہیں۔ عبدالولی نے طالبان کو مخاطب کیا۔

ہاں حافظ صاحب! بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے اس لیے ہم پکڑا۔ طالب نے جواب دیا۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر عبدالولی نے اُس شخص سے کہا جو ان کے ساتھ آرہا تھا کہ آگے بڑھو اور اپنی بہن سے کہو کہ پردہ کرے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

وہ شخص آگے بڑھا اور پھر یہ سب اُس کے پیچھے چل پڑے۔ جب کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں دو کلاشنکوف پڑے تھے۔ عبدالولی نے محمد گل سے کہا، یہ کلاشنکوف اُٹھاؤ۔

محمد گل نے جلدی سے کلاشنکوف اُٹھا لیے۔

بہن جی کہاں ہے؟ عبدالولی نے شخس سے پوچھا۔

وہ دوسرے کمرے میں ہے۔ شخص نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔

عبدالولی کو اب یقین ہو گیا کہ یہ لوگ کسی اور مقصد کیلئے آئے ہیں۔ دوسرے کمرے کی طرف گیا۔ وہاں کوئی ایسا بیٹھا تھا جیسے باندھا گیا ہو۔ چادر اُس پر ڈالی گئی تھی۔

یہ تمھاری بہن ہے؟ عبدالولی نے پوچھا۔

شخص نے جواب دینے کی بجائے اپنا سر نیچے کیا۔

جاؤ یہ چادر ہٹادو۔ عبدالولی نے دوسرے طالب سے کہا۔

جب اُس نے چادر ہٹائی تو ایک شخص بڑے بال ہاتھ، پاؤں باندھے بیٹھا تھا۔ عبدالولی نے جب اُسے دیکھا تو کہا۔

یہ تو آدمی ہے کون ہے یہ؟ ہاتھ پاؤں کھول کر باہر صحن میں لے آؤ۔ عبدالولی یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اِن سب کے ہاتھ باندھ کر گاڑی میں بٹھادو اور اوطاق لے چلو۔ عبدالولی نے طالبان کو حکم دیا۔

وہ شخص جس کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے تھے جب باہر لایا گیا اور عبدالولی نے اُسے غور سے دیکھا تو ایک جست لگائی

تم؟

وہ شخص حیران ہوا کہ یہ کون ہے جو مجھے جانتا ہے۔ تھوڑا آگے ہوا

(c) ketabton.com: The Digital Library

مولوی صاحب! ان لوگوں نے مجھے کہیں دن ہوئے ہیں کہ اغوا کیا ہے اور مجھے پتہ نہیں کہ میں کہاں ہوں؟ مغوی شخص نے عبدالولی سے کہا۔

تم سلیم ہو، لعل محمد کے بیٹے؟ عبدالولی نے پوچھا۔

ہاں، ہاں میں سلیم ہوں۔ آپ مجھے جانتے ہیں؟ سلیم کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی۔

ہاں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

آپ کون ہو، میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟ سلیم کچھ اور قریب ہوا۔

پہچان جاؤ گے۔ چلو۔ سب گاڑی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب گاڑی میں بیٹھ گئے تو طالبان نے سلیم کو بھی پیچھے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ عبدالولی اور اللہ داد اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

کون ہے یہ شخص؟ اللہ داد نے عبدالولی سے پوچھا۔

عبدالولی کے چہرے پر خوشی نمایاں طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے اُس کے ہاتھوں خزانہ لگ گیا ہو۔

یہ میرا چچازاد سلیم ہے۔ عبدالولی ہنس پڑا۔

تمھارا چچازاد سلیم؟ اللہ داد نے حیرانی سے پوچھا۔

ہاں۔ تمھیں یاد ہے ہسپتال میں میں نے تم سے کہا تھا کہ دن دھاڑے لوگ اغوا کیے جاتے ہیں؟ عبدالولی نے اللہ داد کی طرف دیکھا۔

ہاں تم نے کہا تھا۔ اللہ داد نے کہا۔

اُس دن اس سلیم ہی کو لوگ لے گئے، جسے آج خدا نے میرے سپرد کیا۔ میں اسے آسمان پر ڈھونڈ رہا تھا اور خدا نے اسے مجھے زمین پر ملایا۔ عبدالولی نے کہا۔

مگر اُس نے تمھیں نہیں پہچانا اور تم نے پہچان لیا؟ اللہ داد نے پوچھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں نے تو اسے کوئٹہ میں ہی پہچان لیا تھا۔ مونچھ اور داڑھی صاف تھی میں نے اس کی باتیں بھی سنیں ہیں لیکن یہ مجھے نہیں پہچانتا۔ میری اتنی لمبی داڑھی جو ہے اس لیے نہیں پہچان سکا۔ میری داڑھی مونچھ نہیں آئے تھے جب ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ عبدالولی نے کہا۔

تو پھر تم نے کیسے پہچانا؟ اللہ داد نے پھر پوچھا۔

اس نے رنگ نہیں بدلا اور پھر اس کی داڑھی اور مونچھ بھی نہیں تھے۔ تھوڑا موٹا ہوا ہے۔ اگر داڑھی ہوتی تو شاید میں بھی نہ پہچان سکتا۔ عبدالولی نے کہا۔

اوطاق جب پہنچے تو اُن چاروں آدمیوں کو ضلع دفتر کے محکمے بھیجا گیا۔ سلیم کو اوطاق میں رکھا۔ عشاء کی نماز اور کھانے کے بعد عبدالولی اور اللہ داد جب اپنے کمرے میں آئے تو اللہ داد نے عبدالولی سے کہا۔

تم نے سلیم کو اپنا آپ کیوں متعارف نہیں کروایا؟

متعارف کروادونگا، بہت جلد کروادونگا۔ عبدالولی کی آنکھوں میں چمک سی آئی۔

میں تو کہتا ہوں ابھی یہاں بلوالو اور اُسے تسلی دو کہ خدا سب خیر کرے گا۔ اللہ داد نے عبدالولی کو مشورہ دیا۔

وہ تو بہت بڑا آدمی ہے، بڑے آمی کا بیٹا ہے، ہوشیار اور دانا ہے، وہ ہم جیسے جاہلوں کے ساتھ کیسے اس کمرے میں رہ سکتا ہے۔ اُس کے لیے ہمیں کوئی اور بندوبست کرنا ہوگا۔ عبدالولی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

دیکھو! وہ اب تمھارے رحم و کرم پر ہے۔ ایسا کوئی کام نہ کرنا جس سے بدنامی ہو۔ اللہ داد عبدالولی کے ارادے کو بھانپ گیا اس لیے نیک مشورہ دیا۔

میں اسے عبرت کا نشان بنادونگا۔ عبدالولی کمرے میں گھومنے لگا۔

تمھیں یہ حق حاصل نہیں جو اُسے سزا دو۔ اللہ داد نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مجھے یہ حق کسی سے لینا بھی نہیں، خدا نے اُسے خود میرے سپرد کیا ہے، اس لیے کہ اُس سے ہر وہ بدلہ لوں اور تم کہ رہے ہو کہ حق نہیں ہے۔ اُسے کس چیز کا حق حاصل تھا جو ہر وقت میری بے عزتی کرنے پر اپنی عزت محسوس کرتا اور پھر اللہ داد اخوند! تمھیں پتہ ہے۔ عبد الولی اللہ داد کے سامنے تلوؤں پر بیٹھ گیا۔ جس دن اسے اغوا کیا گیا اُس دن اس نے تمام طالبان کو جاہل کہا۔ ہم سب اس کے سامنے جاہل ہیں۔ عبد الولی نے ہاتھوں سے ایسا اشارہ کیا جس سے پورے ملک کی طرف اشارہ تھا۔

یہ تمام باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ حضرت علیؓ کا وہ واقعہ یاد ہے جب وہ ایک یہودی کے سینے پر بیٹھے تھے اُس یہودی نے اُن کے چہرے پر تھوکا۔ حضرت علیؓ نے اُسے اس لیے چھوڑا کہ اُس میں اُن کی ذات کا بدلہ شامل ہوا۔

اللہ داد اخوند! یہ یہودی نہیں ہے اور نہ میں حضرت علیؓ ہوں۔ ایک بھائی کا وہ بیٹا ہے اور دوسرے کا میں بیٹا ہوں۔ ایک دیوار بیچ میں ہے اس کے گھر میں سب کچھ ہے، میرے گھر میں کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ تقسیم تو اللہ کی ہے۔ اللہ داد نے اُس کی بات کاٹ لی۔

میں بھی مانتا ہوں کہ یہ تقسیم اللہ کی ہے۔ مگر اللہ کی تقسیم نے اُسے میرے اور میرے گھر کی بے عزتی کرنے کا حق نہیں دیا تھا، یا پھر دیا تھا۔ آج تو سب کچھ میرے ہاتھوں میں ہے۔ اگر اللہ اس سے حساب نہیں کرتا تو پھر چاہیئے کہ مجھ سے بھی حساب نہ کیا جائے اور اگر اس سے حساب لیا جاتا ہے تو پھر مجھ سے بھی حساب لیا جائے۔ عبد الولی اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ جو مُنہ میں آ رہا تھا بولے جا رہا تھا۔

دیکھو اللہ داد اخوند! عبد الولی جب دروازے کی طرف گیا تو اللہ داد سے مخاطب ہو کر کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

تم اس معاملے میں دخل نہیں دوگے۔ ایسا نہ ہو کہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔ عبدالولی نے ایسے لہجے میں کہا کہ اللہ داد ڈر گیا۔ عبدالولی اپنے کمرے سے نکل کر وہاں گیا جہاں سلیم دوسرے طالبان کے ساتھ بیٹھا تھا۔

تم لوگ اس شخص کو اُس کمرے میں لے جاؤ۔ عبدالولی نے اُس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں پہلے کوئی نہیں گیا تھا۔

حافظ صاحب! وہ کمرہ تو بہت خراب ہے۔ عرصہ ہوا کہ صفائی بھی نہیں ہوئی اور نہ کچھ اُس میں بچھا ہے۔ ایک طالب نے کہا۔

اب ہم اس کیلئے بنگلہ کہاں سے لائیں۔ یہ چٹائی اُٹھاؤ اور وہاں بچھا دو اور ایک تکیہ بھی دے دو۔ عبدالولی نے طالب سے کہا۔

اور ہاں تمھیں چاہیئے کہ کسی چیز کی کوشش نہ کرو، میرا مطلب یہاں سے بھاگنے کی۔ عبدالولی نے سلیم سے کہا۔

حافظ صاحب! میں کیوں بھاگنے کی کوشش کرونگا۔ اگر بھاگ بھی جاؤں تو راستے کا پتہ نہیں۔ سلیم نے بڑی عاجزی سے کہا۔

عبدالولی کو سلیم کی عاجزی اور اُس کے مُنہ سے حافظ صاحب کا لفظ سننے پر ایک فخر سا محسوس ہوا۔

ہاں اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ عبدالولی یہ کہتے ہی واپس اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔

اپنے بستر پر لیٹ گیا، کلاشنکوف جو پہلے دور رکھتا اب اپنے تکیے کے نزدیک رکھی۔ پیٹھ کے بل لیٹ کر چھت کو بغور دیکھنے لگا۔ خیالوں میں اُس کا بچپن اُس کے سامنے ایک فلم کی طرح گزرنے لگا۔

اُس کا باپ اور سلیم کا باپ۔ اپنی ماں کے کپڑے اور سلیم کی ماں کے کپڑے۔ اپنے گھر کی نحوست اور سلیم کے گھر کی ہستی۔ وہ دن اُس کے ذہن میں ایسے تازہ ہوئے جیسے کل ہی کی بات

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہو۔ اُس دن اُس کی بہن گل پانڑا پیدا ہوئی تھی۔ ماں نے پورا دن کچھ نہیں کھایا تھا۔ پھر بچے کی پیدائش کی وجہ سے کمزور پڑ گئی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ گاؤں کی بوڑھی عورتیں جو کہ بچے کی پیدائش کیلئے آئیں تھیں نے پہلوان سے کہا۔

پہلوان! خال دارہ بہت کمزور ہے، اگر کہیں سے دیسی گھی کا بندوبست ہو جائے تو میں اُس سے اُس کیلئے لیٹی بنالوں گی اور اسے کھلالوں گی تا کہ دل کو تقویت ملے۔ اگر کہیں سے مرغی کا بندوبست ہو جائے تو یہ بہت اچھا ہو گا، اُس کیلئے یخنی بھی بنالیں گے۔

پہلوان نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ پھر عبدالولی سے کہا۔

ولی بیٹا تم وہ پیالہ اُٹھاؤ لعل محمد کے گھر چلتے ہیں ہو سکتا ہے وہاں سے کچھ گھی مل جائے۔ گائے کو تو تین مہینے ہوئے کہ اُس نے بچہ جنا ہے۔

عبدالولی نے بھی پیالہ اُٹھایا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔ جب بھائی کے گھر پہنچا تو بھائی اور بھابھی کے سامنے پلیٹ میں پستہ اور بادام پڑا تھا۔ دودھ پتی چائے سے کپ بھرے پڑے تھے۔ سلیم اپنے بھائی او بہنوں کے ساتھ کھیل میں مشغول تھا۔ پہلوان لعل محمد سے کچھ سال بڑا بھی تھا۔ اس کے باوجود لعل محمد نے بیٹھے بیٹھے پہلوان کو سلام کیا پھر اپنی بیوی سے کہا

رات کو اُن مرغوں کے پیس بنالو مہمان آئیں گے۔ اور وہ دیسی گھی میرے ایک دوست کو بہت پسند ہے اُس کے لیے تیار رکھو تا کہ اُسے دے سکوں۔

تم تو بہت ہی پریشان حال شخص ہو، میں نے سب کچھ کیا ہے تم اپنی چائے پی لو۔ بیوی نے کہا۔

پہلوان لالا! آپ کیسے آئے تھے۔ میرے خیال سے آج مزدوری پر نہیں گئے تھے۔ لعل محمد نے پہلوان سے پوچھا۔

آج میں نے سارا دن گھر پر گزارا، ولی کی ماں بیمار تھی، دوپہر کو میری بیٹی پیدا ہوئی۔۔۔۔۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

پہلوان لالا، آپ کو بھی کوئی اور کام نہیں، جب دیکھو بچہ پیدا ہوا۔ لعل محمد نے پہلوان کی بات پوری ہونے سے پہلے اُس پر تنقید کی۔

لالو! یہ تو خدا کا لکھا ہے۔ جب خدا عطا کرتا ہے تو اُس میں میں کیا کر سکتا ہوں۔ پہلوان نے کہا۔

ایک تو آپ مجھے اس آدھے نام سے نہ پکاریں۔ کام خود کرتے ہو اور الزام خدا پر۔ لعل محمد اور اس کی بیوی دونوں ہنس پڑے۔

میں کہہ رہا تھا کہ ولی کی ماں بہت کمزور ہو گئی ہے۔ گھر میں کچھ تھا نہیں اگر ایک پیالی دیسی گھی دے دیتے یا پھر ایک مرغی وغیرہ، جب خدا دن پھیر دے گا تو واپس کر دونگا۔ پہلوان نے اپنا مدعا بیان کیا۔

آج کیسے نیچی نظروں سے آرہے ہو، جب تمھاری بیوی سے کہتی ہوں کہ گائے کا تبیلہ صاف کرے تو وہ نخرے کرتی ہے۔ یا پھر دوسرے کام کا کہتی ہوں تو برابری کرتی ہے۔ آج جب بچہ جنا تو میری گائے کا گھی چاہیئے۔ مُنہ میں خاک ہو، جب خدمت کا موقع آتا ہے تو برابری کرتی ہے۔ ساری زندگی تم لوگوں نے مانگ کر گزاری، تم لوگ ہو کہ سیر نہیں ہوتے۔ آج گھی دو، آج چینی نہیں، ایک تھالی آٹا دیں، کچھ تو تم لوگوں کے گھر میں بھی ہونا چاہیئے تھا۔ لعل محمد کی جگہ بیوی نے جواب دیا۔

بھابھی یہ آپ عورتوں کی باتیں ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آتیں مگر، میں کیا کروں، سارا دن کام کرتا ہوں جو خدا نے قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ مل جاتا ہے اور میں۔۔۔۔۔۔۔۔

اور کیا، ہم نے آپ لوگوں کا ٹھیکہ نہیں اُٹھایا۔ آپ لوگوں کی وجہ سے ہم سکون کا نوالہ تک نہیں کھا سکتے۔ لعل محمد کی بیوی یہ کہتے ہوئے اُٹھ گئی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

پہلوان لالا! سلیم کی ماں ٹھیک کہتی ہے، آپ بھی تو وقت بے وقت آ جاتے ہو، کوئی نہ کوئی چیز چاہیئے ہوتی ہے۔ جب کام کا وقت آتا ہے تو پھر غائب ہو جاتے ہو۔ لعل محمد نے اپنے بھائی سے کہا۔

اسی اثناء سلیم بھی آ گیا۔ پھر کیا مانگنے آئے ہو۔ سلیم نے عبدالولی سے کہا۔

میری ماں بیمار ہے، گھی مانگنے آئے ہیں۔ عبدالولی نے کہا۔

تمھاری بھی ماں ہے، ہر وقت بیمار رہتی ہے اچھا ہے کہ مر جائے۔ اس ماں سے تو نہ ہی ہو اچھا ہے۔ سلیم نے کہا۔

تمھاری ماں مر جائے۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

سلیم نے عبدالولی کو ایک زور کا تھپڑ مارا۔ تم میری ماں کو مارو گے۔ پھر اُسے دھکا دیا۔ عبدالولی کے ہاتھوں سے پیالہ گر کر ٹوٹ گیا۔ لعل محمد غصے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک زوردار تھپڑ عبدالولی کے گردن پر دے مارا۔

اُٹھاؤ یہ گند، ایک تو بھیک مانگتے ہو اور پھر اوپر سے بات بھی بُری لگتی ہے۔ اور آپ ۔۔۔۔ لعل محمد پہلوان کی طرف متوجہ ہوا۔ بس بچوں کے پیدا کرنے کے پہلوان ہو۔ کھانے کو تو کچھ دے نہیں سکتے۔ جیسے آپ ہیں ویسے بچے بھی جاہل ہیں۔ جیسا باپ ویسی اولاد۔

عبدالولی اپنے بستر پر بیٹھ گیا، کلاشنکوف کو دیکھا، پھر اللہ داد کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھیں بند تھیں، عبدالولی نے کلاشنکوف اُٹھائی، اُس کمرے کی طرف گیا جہاں سلیم سویا تھا، عبدالولی نے دروازہ کھولا، سلیم چٹائی پر سر گٹنوں میں دیے سو رہا تھا۔ اُس کا چہرہ دروازے کی طرف تھا، دوسری طرف کھڑکی میں چراغ جل رہا تھا جس کی پیلی روشنی سلیم کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

عبدالولی نے جب سلیم کے چہرے کی طرف دیکھا تو سارا غصہ اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا۔ آنکھوں کے راستے سلیم کے چہرے پر نفرت بھری نظر پڑی، کلاشنکوف کی نلی سلیم کی طرف کی۔

آج میں یہ ساری گولیاں تمھارے خوبصورت دماغ میں ڈالوں گا، جس دماغ پر تم ناز کرتے تھے اور کرتے ہو۔ نہیں، نہیں، اتنی آسان موت کہاں دونگا۔ عبدالولی اپنے آپ سے دھیمی آواز میں مخاطب تھا۔

ایسی سزا دونگا جس سے موت بھی پناہ مانگے گا۔ اور تمھاری ماں تمھاری زندگی کی نہیں تمھاری موت کی دعائیں مانگے گی۔ جس کی خاطر تم نے مجھے ساری زندگی ضلالت کے کنویں میں دھکیل دیا۔ عبدالولی نے کلاشنکوف کو ہاتھ میں مضبوطی سے گھومایا تو کلاشنکوف سے آواز اُبھری۔

کک، کک، کون ہے، میں نے کچھ نہیں کیا۔ سلیم ڈرتے ہوئے نیند سے اُٹھا۔

کک کون ہو؟ سلیم چٹائی پر بیٹھ گیا۔

سو جاؤ دوسروں کو جگا دو گے۔ عبدالولی نے اُسے پاؤں سے دھکیلا۔

سلیم پیٹھ کے بل چٹائی پر گر گیا۔

میں نے کیا کیا ہے۔ سلیم کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور یہ کون ہے۔ ابھی تک نیند اور خوف کے اثر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ عبدالولی واپس نکل آیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اپنے کمرے میں گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوچ کر گئی تھی۔ مختلف سوچوں میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ صبح کی آذان کے ساتھ آنکھ لگ گئی۔ خواب دیکھ رہا تھا۔ خواب میں زرقا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چھوٹی زرقا جو اس کیلئے چیزیں لاتی تھی اگرچہ زرقا اُسی طرح چھوٹی مگر وہ باتیں اس طرح کر رہی تھی جیسے بڑی عورت۔ خواب میں زرقا اُس سے التجا کرتی ہے۔

عبدالولی! میرے سر سے دوپٹہ مت چھینو۔ دیکھو میری حیا مجھ سے مت لو۔ یہ دوپٹہ میرا سب کچھ ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

بس اس دوپٹے کی بات کرتی ہو؟ وہ اُسے دلاسہ دیتا ہے ہے لیکن وہ صرف یہی التجا کرتی۔ خواب میں جب زرقا اُس کا ہاتھ پکڑتی ہے تو وہ جاگ جاتا ہے۔ عبدالولی کی جب آنکھ کھلی تو وہ حیران تھا کہ زرقا اُس کے خواب میں کیسے آئی۔ کچھ وقت کیلئے سوچوں میں پڑا۔ پھر نماز کیلئے اُٹھا۔ نماز کے بعد جب ریڈیو لگایا تو ریڈیو میں خبریں شروع تھیں کہ امریکہ اور دوسرے ممالک نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ والی صاحب سے رابطے پر معلوم ہوا تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کر دی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۲۰)

عبدالولی معمول کے مطابق صبح اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گاڑی میں گشت پر نکلا۔ شہر میں حالات معمول پر تھے لیکن خاموشی چھائی تھی۔ جب دوپہر کو واپس اپنے اوطاق کھانا کھانے آئے تو سلیم کو اپنے کمرے میں بلایا۔ سلیم جس کی داڑھی بڑھ چکی تھی ڈرا ہوا اُس کے کمرے میں آیا۔

یہاں بیٹھو! عبدالولی نے تُند لہجے میں کہا۔

بیٹھنے کے بعد عبدالولی نے پوچھا۔

کیا کام کرتے ہو؟

کوئٹہ میں ایک تنظیم ہے اُس کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ سلیم نے پوری بات چُھپالی۔

کس طرح کی تنظیم؟ سرکاری نوکری ہے یا پھر غیر سرکاری کام کر رہے ہو (عبدالولی نے وہ بات چُھپالی جو اُن چاروں آدمیوں نے محکمے کے دفتر میں کی تھی کہ یہ این جی اوز کا آدمی ہے اور طالبان کے پیچھے غلط بیانی کرتا ہے۔ اسے اس لیے یہاں اُٹھالائے ہیں، پیسوں کی لالچ میں نہیں لائے ہیں)

سلیم کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ اس لیے اگر سچ بولے بھی تو جان نہیں چُھوٹے گی اور اگر جھوٹ بولے بھی تو نہیں۔ اسی سوچ میں تھا کہ کیا کہوں کہ عبدالولی نے پھر پوچھا۔

کن سوچوں میں پڑ گئے میں نے کیا پوچھا؟

ہاں، ہاں، نہیں، نہیں، سرکاری نہیں ہے۔ سلیم اپنی باتوں میں الجھ گیا۔

صحیح بات بتاؤ، یہ کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو۔ عبدالولی نے غصے سے کہا۔

حافظ صاحب! این جی او میں ہوں، غیر سرکاری ادارہ ہے۔ سلیم نے سچ کہا۔

ہاں، تم سے اسی چیز کی توقع تھی۔ عبدالولی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

میں سمجھا نہیں حافظ صاحب!۔ سلیم کے سچ بولنے سے حواس اپنی جگہ پر آ گئے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

سمجھا دونگا چچازاد۔ تم اتنے بھولے بھی نہیں جو اس بات کو نہیں سمجھے۔ مجھ جیسا جاہل اگر یہ کہے تو کوئی گلہ نہیں، تم تو قابل شخص ہو تم کیسے نہیں سمجھے۔ عبد الولی نے کہا۔

سلیم حیران تھا کہ یہ کیسی پہیلیاں بُوجھ رہا ہے۔ بس نفی میں سر ہلا دیا۔

زبان کیوں گونگی ہو گئی، جواب دو۔ سانڈ کی طرح سر مت ہلاؤ۔

حافظ صاحب! سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہوں؟ سلیم نے بڑی بے بسی میں کہا۔

بے بسی بہت بُری بلا ہے سلیم خان۔ انسان سے عقل و دانش سب کچھ چھین لیتی ہے۔ عبد الولی نے سلیم کو اپنے نام سے پکارتے ہوئے کہا۔

سلیم حیران تھا کہ میں نے تو اسے نام نہیں بتایا تو پھر اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا۔

چچا کے بیٹے! پریشان نہ ہو۔ زندگی امتحان کا نام ہے، جو بھی بویا ہے اُسے کاٹنا پڑے گا۔ عبد الولی اُٹھ کر سلیم کے پیچھے کھڑا ہوا۔

سلیم اپنے ذہنی پریشانی کے سبب عبد الولی کے اشاروں کو سمجھ نہیں پارہا تھا کہ کبھی چچا زاد تو کبھی چچا کا بیٹا کیوں کہہ کر پکار رہا ہے۔

حافظ صاحب! میں اپنے لیے پریشان نہیں ہوں، میں تو گھر کیلئے پریشان ہوں۔ ماں، باپ، بچے کس حال میں ہونگے۔ وہ میرے لیے بہت پریشان ہونگے۔ سلیم نے عبد الولی کی باتوں کے جواب میں اپنی پریشانی ظاہر کر دی۔

میرے ماں باپ بھی اسی طرح پریشان ہوئے تھے۔ اب بھی پریشان ہونگے۔ اچھا ہے کہ اس درد سے مانوس ہو جاؤ۔ تم بھی اور تمھارے ماں باپ بھی۔ تم مجھے جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ عبد الولی نے اپنے آپ کو متعارف کرانے کا فیصلہ کیا۔

نہیں، نہیں جانتا۔ سلیم نے جواب دیا۔

میں تمھارا چچازاد دوسروں کے ٹکڑوں پر پلا ہوا ولی ہوں۔ پہلوان چچا کا بیٹا ولی ہوں۔ عبد الولی نے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

عبدالولی؟ سلیم نے ایسے کہا جیسے نیند میں ہو۔

عبدالولی نہیں، ولی۔ وہ ولی جسے تم اپنی خاطر میں بھی نہیں لاتے تھے۔ جسے ہر وقت تم نے کم اور نچلی سطح کی نظر سے دیکھا۔ عبدالولی نے تلخ جواب دیا۔

عبدالولی تم؟ سلیم اُٹھ کھڑا ہوا۔

تمھارا تو حال احوال تک نہیں تھا۔ نا ہی زندگی کا اور نہ ہی موت کا۔ سلیم نے اپنوں کی طرح پوچھا۔

تم تو بہت خوش ہوئے ہوگے کہ ایک جاہل غائب ہو گیا۔ جان چھوٹ گئی۔ عبدالولی نے اُسی لہجے میں کہا۔

عبدالولی تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تمھارا مطلب ہے کہ میں تمھارا دشمن ہوں یا تم میرے دشمن ہو۔ سلیم نے کہا۔

دشمن تو پھر بھی اچھا ہوتا ہے معلوم تو ہوتا ہے۔ تم تو وہ ہو جسے لوگ میرا اپنا کہتے ہیں مگر تم نے اپنوں کی لباس میں میرے ساتھ وہ کیا ہے جو دشمن بھی دشمن سے نا کرے۔ عبدالولی نے کہا۔

میں نے تمھارے ساتھ کیا دشمنی کی ہے۔ ہم نے تو بیس سال سے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں۔

میں تمھاری وجہ سے بے گھر ہوا۔ بھول گئے یا حافظہ کمزور ہو گیا کیا۔ لیکن میں ابھی تک نہیں بھولا۔ عبدالولی نے کہا۔

تم نے بچپن کی باتیں دل میں رکھی ہیں، وہ تو بچپنا تھا، کم عقلی تھی۔ ضرور ہم ایک دوسرے سے لڑے ہونگے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں تمھارا دشمن ہوں۔ سلیم نے جواب دیا۔

مانتا ہوں تم بچے تھے۔ تمھارے ماں باپ تو بچے نہیں تھے، وہ تو بے وقوف نہ تھے۔ عبدالولی نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

کیوں انہوں نے کیا گناہ کیا ہے؟ سلیم نے پوچھا۔

ام، گناہ۔ غلامی کا طوق کسی کے گلے میں ڈالنا گناہ نہیں۔ ہر جگہ، ہر کسی کے سامنے کسی کی بے عزتی کرنا گناہ نہیں، غلام کی نظروں سے دیکھنا گناہ نہیں، ہماری بے بسی کا تم لوگوں کی دولت کے نیچے دب جانا گناہ نہیں۔ آخر تم گناہ کہتے کس چیز کو ہے؟ عبدالولی جذباتی ہوا۔

میرا گناہ یہ ہے کہ میں پہلوان کے گھر پیدا ہوا۔ اور پہلوان کا گناہ یہ تھا کہ وہ صرف غریب تھا۔ دو ہاتھوں کی مزدوری سے گزارا کرتا تھا۔ تمھاری خوش قسمتی یہ ہے کہ تم لعل محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ اگرچہ لعل محمد اور پہلوان ایک باپ کے بیٹے تھے لیکن معاشرے کی نظر میں ایک بے عزت اور دوسرا عزت دار تھا۔ پہلوان کے بچے جاہل اور کسی بھی چیز کا حق نہیں رکھتے، اور لعل محمد کے بچے سمجھدار اور ہر چیز کا حق رکھتے تھے۔ پہلوان کے بچے محرومی کی زندگی گزاریں جیسے میں، اور تم لوگوں کے حصے میں سب کچھ ہو۔ سمجھ، علم، دانائی یہ سب کچھ تم لوگوں کے پاس ہو اور ہمارے پاس، جہالت اور اندھیرا۔ ہم تو اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہیں جن کے حصے میں محبت تک نہیں۔ کبھی کسی نے ہم سے محبت نہیں کی۔ ہمیشہ نفرت کے کوڑے برسائے گئے اُس سے کون محبت کرے گا۔ ہم سے تو خدا نے بھی محبت نہیں کی۔ تم لوگوں کو سب کچھ دیا اور ہمیں طالبان بنایا۔ طالبان اس معاشرے کا وہ کردار ہے جو محرومی کا دوسرا نام ہے۔ طالب تو بس طالب ہے، ساری زندگی طلب میں گزارتا ہے۔ کبھی کھانے کی طلب، کبھی علم کی طلب۔ تم جیسے اپنے ہمیں ماں باپ کی شفقت سے دُور کر دیتے ہیں۔ نہ کسی نے پیار سے پکارا ہے اور نہ ہی بٹھایا ہے۔ عبدالولی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اُس کی آواز رونے جیسی ہو گئی۔

یہ لوگ، ہمارے معاشرے کے لوگ، ہر کوئی طالب کو اس لیے عزت دیتا ہے کیونکہ اسے ثواب سمجھا جاتا ہے۔ کھانا خیرات کا دیتے ہیں، پیسے زکوٰۃ کے دیتے ہیں۔ تم جیسے مالدار لوگوں کے ہاں جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اُس کے کان میں آذان دیتے ہیں۔ یا پھر مالدار گھرانے کے کسی مُردے کے ایصال ثواب کیلئے قرآن ختم کرتا ہے۔ اس معاشرے نے ہمیں بس یہی کچھ

(c) ketabton.com: The Digital Library

دیا ہے۔ بچپن میں کھیلنے کا حق چھینا ہے، پیار کا حق چھینا، اپنے گھر اور اپنوں کے ساتھ رہنے کا حق چھینا۔ پھر کیوں لوگ ہم سے محبت کی توقع کرتے ہیں؟ عبدالولی کے لاشعور میں چھپی محرومیاں جذبات کے سیلاب کے ساتھ اُبھر آئیں کہ عبدالولی خود بھی سمجھ نہیں پایا۔

عبدالولی! تمھیں پتہ ہے اس وقت تمھارے ہاتھوں میں کتنی طاقت ہے۔ تم یہاں بہت سی چیزوں پر قدرت رکھتے ہو۔ نفرت کی جگہ محبت کی آبیاری کرو۔ اس علاقے میں جہاں تک تمھاری دسترس ہے محبت کی بیج بو دو۔ وہ بیج جو حضرت محمد ﷺ نے مدینہ میں بویا تھا۔ جس بیج کی بدولت عورت کو عظمت کا مقام حاصل ہوا۔ کنیز ماں بن گئی، بیوی بن گئی، بہن بن گئی اور محبت کی علامت بن گئی۔ سلیم نے ایک بڑے عالم کی طرح بات کی کہ اپنے آپ کو اچھا دکھائے اور ہمدردی حاصل کرے۔

بس، بس۔ یہ باتیں کتابوں میں اچھی لگتی ہیں۔ عبدالولی نے اپنے چچازاد بھائی کی بات کاٹ لی۔

حقیقت کی زندگی کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں، تمھیں آج محبت کے بیج کی یاد آئی۔ محمد ﷺ کا عمل یاد آیا جب میرے ہاتھ میں طاقت ہے۔ اُس وقت یہ محبت کہاں تھی جس وقت تمھارے گھر سے سوکھی روٹی کا نوالہ تک نہ دیا جاتا۔ تم صاف کپڑے پہن کر گاڑی میں سکول جاتے اور میرے پاس عید کے بھی کپڑے نہیں تھے۔ اس محبت کی تعلیم جن لوگوں نے تمھیں دی ہے وہ اُس وقت کہاں تھے۔ اُس وقت کو چھوڑو آج بھی ہمارے گاؤں میں میری ماں اور بہن تم لوگوں کے کپڑے دھوتی ہونگی۔ میرے بھائی آج بھی پہلوان کے حرام زادے ہونگے۔ تم اور تمھارا بھائی لعل محمد کے اچھے بیٹے۔ یہ فرق کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ اور تم جیسے این جی اوز کے تیار کردہ یہ کام کرتے ہیں۔ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ خود کو افلاطون سمجھتے ہیں اور ہمیں جاہل۔

اسی اثناء میں اللہ داد بھی کمرے میں داخل ہوا۔

خیر ہے کیا کہہ رہے ہو ایک دوسرے سے۔ اللہ داد نے عبدالولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

کچھ نہیں اس افلاطون کی باتیں سُن رہا ہوں۔ عبدالولی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

تم کیسے ہو میرے بھائی۔ کچھ دماغ ٹھکانے آ گیا۔ اللہ داد نے سلیم سے پوچھا۔

ٹھیک ہوں مولوی صاحب۔ عبدالولی میرا چچازاد بھائی ہے۔ سلیم نے پُر امید لہجے میں کہا۔

یہ تو بہت اچھا ہوا کہ ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اللہ داد نے جواب دیا۔

گھر کا حال احوال دیا کہ نہیں؟ اللہ داد نے سلیم سے پوچھا۔

اس نے گھر کا حال نہیں پوچھا۔ سلیم نے عبدالولی کی طرف اشارہ کیا۔

یار تم تو پتھر دل ہو، گھر کا حال بھی نہیں پوچھا۔ اللہ داد نے عبدالولی سے کہا۔

کس سے پوچھوں، اِس سے۔ عبدالولی نے سلیم کی طرف اشارہ کیا۔

اسے میرے گھر کا حال احوال کیا معلوم۔ اللہ داد اخوند! یہ اتنا خود غرض ہے کہ اپنے سوا کسی دوسرے کا حال تک نہیں پوچھتا۔ عبدالولی نے کہا۔

تم اس کی باتوں کو چھوڑو مجھے بتاؤ کہ حافظ صاحب کے ماں باپ، بہن بھائی کیسے ہیں۔ اللہ داد نے سلیم سے پوچھا۔

سب ٹھیک ہیں۔ بھائیوں نے شادی کی، بہنوں کی بھی شادی ہو گئی۔ چھوٹی بہن کی شادی پچھلے ماہ ہوئی۔ سلیم نے جواب دیا۔

کیا، کیا کہا؟ گل پانڑا کی شادی ہو گئی۔ عبدالولی سب کچھ بھول کر سلیم کے سامنے بیٹھ گیا۔

ہاں شادی ہو گئی۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ تمھارے لیے بہت رو رہی تھی، تمھیں یاد کر رہی تھی۔ کہ میرا طالب لالا نہیں ہے، میری مانگ کون نکالے گا۔ سلیم نے کہا۔

پھر کیا ہوا؟ عبدالولی نے بچے کی طرح پوچھا۔

پھر زر قانے کہا کہ جیسے گھر میں شادی نہیں فوتگی ہو گئی ہو۔ گل پانڑا کی شادی نہیں بلکہ گھر سے جنازہ نکل رہا ہو۔ سلیم نے جواب دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس بات نے عبدالولی کے دل میں طوفان سا برپا کر دیا، وہ تمام احساسات اور جذبات کانپنے لگے جو وقت اور حالات کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ اُس کے پر نکل آئیں اور وہ اُڑ کر گھر پہنچ جائے۔ کھڑا ہو کر کمرے میں چکر لگانے لگا پھر تھوڑی دیر بعد کچھ سوچنے کے بعد آیا اور کہا۔

تم شادی پر گئے تھے؟ عبدالولی نے سلیم سے پوچھا۔

نہیں، میں اُس دن اسلام آباد گیا تھا۔ سلیم نے جواب دیا۔

تو پھر یہ تم سے کس نے کہا؟ عبدالولی نے پھر پوچھا۔

زرقا، میری بیوی نے۔ سلیم نے جواب دیا۔

زرقا، تمھاری بیوی۔ عبدالولی سوچنے لگا۔ پھر پوچھا۔

تم نے شادی کہاں کی؟

ساتھ والے گاؤں ملک صالح کی بیٹی سے شادی کی۔ سلیم نے جواب دیا۔

عبدالولی کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کی دل کی رگیں کاٹ لی ہوں۔ چکر لگاتے لگاتے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اللہ داد اور سلیم کو کمرے میں چھوڑ دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۲۱)

ملک کے حالات اس سطح پر پہنچے تھے کہ طالبان کو ہر جگہ مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ امریکہ اور اتحادی ممالک کے حملوں میں شدت آگئی تھی۔ کابل اور بہت سے دوسرے علاقے طالبان کے قبضے سے نکل چکے تھے۔ بہت سے طالبان صوبہ قندہار میں اکٹھے ہو گئے تھے قریب تھا کہ پورا ملک طالبان کے کنٹرول سے نکل جائے۔ یہ سب اتنا جلدی ہوا کہ بجائے چند بڑے طالبان کے باقی کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسے اور کیوں ہوا۔ وہ دھاگا کیسے ٹوٹا جس سے یہ پروئے گئے تھے۔ تمام رابطے ایسے منقطع ہوئے جیسے تھے ہی نہیں۔ شاید وہ قوت پیچھے ہٹ گئی جس نے رابطے کی کڑیاں برقرار رکھی تھیں۔ ان چند بڑے لوگوں میں جنہیں یہ سب کچھ پتہ تھا ایک عبدالولی کے صوبے کا والی صاحب تھا۔ ان حالات میں والی صاحب نے عبدالولی کو بلا بھیجا اور اپنی بات اُس سے یوں کہی۔

حافظ صاحب! حالات ایسے دکھائی دے رہے ہیں جیسے اب سارا ملک ہمارے کنٹرول سے نکل جائے گا۔ ہم بہت دیر تک مدافعت نہیں کر سکیں گے۔ ہماری اُن تمام جگہوں کی نشاندہی ہو چکی ہے یا پھر تباہ کر دیے گئے ہیں جن سے ہم جُڑے ہوئے تھے۔ تمام رابطے منقطع ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں چاہیئے کہ ہم ایک فیصلہ کریں۔ تمھیں بلایا بھی اسی لیے ہے کیونکہ تم میرے خاص لوگوں میں سے ہو۔ والی صاحب نے عبدالولی سے کہا۔

شکریہ والی صاحب! یہ آپ کی محبت ہے جو مجھے اس قابل سمجھا۔ آپ کے خیال میں کیا کرنا چاہیئے؟ عبدالولی نے پوچھا۔

میں نے صوبے کے اُن تمام لوگوں سے جو ذمہ دار اور قابل اعتبار ہیں سے بات کر لی ہے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم خود کو کچھ عرصے کیلئے کہیں روپوش کر دیں۔ والی صاحب نے جواب دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

کیسے اپنے آپ کو روپوش کر دیں؟ میں کچھ سمجھا نہیں والی صاحب۔ عبدالولی نے وضاحت مانگی۔

بجائے اس کے کہ ہم لڑیں ہمیں جگہ چھوڑنی ہو گی۔ والی صاحب نے جواب دیا۔

آپ کا مطلب ہے کہ ان کافروں کو ملک حوالے کیا جائے، ان کے خلاف جہاد نہ کریں۔ عبدالولی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

اُن کے ساتھ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے، وہ آسمان پر ہیں اور ہم زمین پر۔ وہ ہمیں زمین پر مار سکتے ہیں مگر ہم انہیں آسمان پر نہیں مار سکتے اور نہ ہی ان حالات میں کوئی ہماری مدد کرنے کو تیار ہے۔ والی صاحب نے جواب دیا۔

ہم نے کب کسی سے مدد مانگی ہے۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ وہ بھی کبھی زمین پر اُتریں گے کہ نہیں؟ عبدالولی نے کہا۔

میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ جب ہم زمین خالی کریں گے تب وہ بھی زمین پر اُتر آئیں گے۔ والی صاحب ہنسا۔

میں سمجھتا ہوں والی صاحب کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ صاف الفاظ میں کہیں کہ میں کیا کروں۔ عبدالولی اب بھی والی صاحب کے مطلب کو نہ سمجھ سکا۔

میں کہہ رہا ہوں کہ اگر حالات مخدوش ہو گئے تو اس سے پہلے کسی کے بھی حکم کا انتظار مت کرنا روپوش ہو جانا اور بس۔ والی صاحب نے صاف الفاظ میں کہا۔

ٹھیک ہے اگر آپ کہتے ہیں تو ایسا ہی ہو گا۔ عبدالولی نے ناسمجھے شخص کی طرح جواب دیا۔

والی صاحب نے عبدالولی کو رخصت کیا۔ عبدالولی اپنے ضلع کی طرف روانہ ہوا۔ عبدالولی راستے میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا کھیل ہے جو میں سمجھ نہیں پا رہا۔ بجائے اس کے کہ شہادت کی طرف جائیں جگہ کیوں خالی کر رہے ہیں۔ وہ بھی ایسے حالات میں جہاں ہم ایک دوسرے سے بے

(c) ketabton.com: The Digital Library

خبر ہیں۔ میں تو کسی حال میں بھی نہیں جاؤنگا یہیں شہید ہو جاؤنگا مگر یہاں سے جاؤنگا نہیں۔ عبد الولی نے اپنے آپ سے فیصلہ کیا۔

جب اوطاق پہنچا تو ساری باتیں اللہ داد سے کہی۔

مجھے کچھ اندازہ تھا کہ حالات خراب ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ حالات یہاں بھی خراب ہو جائیں تم اور سلیم یہاں سے نکل جاؤ۔ اللہ داد نے عبد الولی سے کہا۔

سلیم کو گھر لے جاؤں۔ تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ سلیم کے نام پر عبد الولی آپے سے باہر ہو گیا۔

ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اس میں دماغ کے خراب ہونے کی کیا بات ہے۔ اللہ داد نے کہا۔

جب تک اُس پر اُس کے سارے گھر کو رُلا نہ دوں تب تک نہیں چھوڑونگا۔ عبد الولی کی آنکھوں میں انتقام نظر آنے لگا۔

واہ بہت اچھے۔ اسلامی امارت کے " امر بی المعروف و نہی عن المنکر " کے امیر بہت اچھے۔ اسی لیے تو اسلامی امارت گرنے کو جا رہی ہے جس میں تم جیسے لوگ حکمران ہیں۔ جو کہ اسلامی احکام اور اصولوں کی بجائے اپنی من مانی کرتے ہیں۔ بدلہ لینے کیلئے اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اللہ داد جذباتی ہوا۔

کیا کہا؟ عبد الولی کو اُس کی باتوں پر غصہ آ گیا۔

یہ جو ہم اسلام کی بدنامی کا باعث بنے ہیں۔ محمد ﷺ کی میراث پر بیٹھ کر نفرت کا بیج بو رہے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں اسلام کیلئے نفرت بوئی۔ یہاں اس ضلع میں ڈنڈا ہاتھ میں لیے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ اللہ داد نے ارد گرد اشارہ کیا۔

لوگ خدا سے نہیں تم سے ڈرتے ہیں۔ اسی لیے تو ہر وقت بے وضو نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اس عوام کو دنیا کی اقوام کے ساتھ برابری کیلئے بہت پیچھے چھوڑا۔ اسلام سے محبت کی بجائے ڈر کا طوق ان کے گلوں میں ڈال دیا۔ عبد الولی اخوند! ہم ان بیچارے عوام سے اپنی

(c) ketabton.com: The Digital Library

محرومیوں کا بدلہ لے رہے ہیں، حکمرانی کے تقاضے پورے نہیں کر رہے۔ تمھاری مرضی، کلاشنکوف اُٹھاؤ اور سلیم کی زندگی کا خاتمہ کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس نے تمھارے اور تمھارے گھر کے ساتھ بہت بُرا کیا ہو گا مگر اتنا بُرا نہیں کیا ہو گا جتنا نبی کرم ﷺ کے چچازاد بھائی حمزہؓ کے ساتھ ہندہ نے کیا۔ کاش محمد ﷺ کی زندگی اور تعلیمات کے معیار کو ہم اپنی زندگی میں پیدا کرتے۔ اللہ داد اسی جذبات میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

عبدالولی اپنی جگہ پر بت بنا کھڑا رہ گیا۔ آنکھیں اور مُنہ کھلا دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب تک اللہ داد نکل رہا تھا حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی اللہ داد ہے جو بچپن سے میرے ساتھ ہے۔ ہر چیز میں میرے ساتھ۔ آج اسے کیا ہوا؟

نہیں، نہیں۔ میں تمھاری باتوں میں نہیں آؤنگا۔ میں وہ کرونگا جو میرا دل چاہے گا۔ میری زندگی کے تمام ارمان، اس ظالم نے میری کی ہر خوشی مجھ سے چھین لی ہے۔ زرقا سے بھی شادی کرلی۔ عبدالولی پاگلوں کی طرح اپنے آپ سے غصے اور ارمان کے ملے جُلے جذبات میں باتیں کر رہا تھا۔

میں اُسے وہاں ذبح کرونگا جہاں میں ہر روز اپنے ارمان جلاتا آرہا ہوں۔ اُس کا غلیظ وجود اسی خنجر سے کاٹوں گا۔ عبدالولی نے اپنا خنجر اپنی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

اس خنجر سے اُس کے وجود کا غلیظ خون نکالوں گا۔ عبدالولی پاگلوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ عبدالولی نے عصر کی گشت کے بعد مغرب کی نماز ادا کی۔ جلدی اوطاق آیا۔ اوطاق میں ایک طالب سے کہا۔

ایک رسی میرے کمرے میں لے آؤ۔

طالب رسی عبدالولی کے کمرے میں لے آیا۔ عبدالولی نے رسی اپنے کپڑوں کے بکس کے ساتھ رکھ دی۔ پھر یہ تسلی کی کہ خنجر اُس کے پاس ہے یا نہیں۔ خنجر بھی پاس تھا۔ عبدالولی نے

(c) ketabton.com: The Digital Library

اپنے آپ سے فیصلہ کیا تھا کہ آج سلیم کو اُس ندی پر لے جا کر جہاں وہ کبھی کبھار جایا کرتا ہے اُسے ذبح کرے گا۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

رات کو کھانے پر اللہ داد بھی پہلے کی طرح موجود تھا۔ مگر دوپہر کے کھانے پر جو باتیں ہوئیں اُن باتوں نے دھیان خراب کیے ہوئے تھا۔ ایسا نہ ہو کہ عبدالولی نے اُن باتوں کو سنجیدہ لیا ہو اور ناراض ہو۔

حافظ صاحب! آج تمھاری آنکھیں پھر سرخ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں میں نے کچھ زیادہ بول دیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھ پر اتنا غصہ ہو جاؤ۔ اللہ داد نے ایک مہربان دوست کی طرح کہا۔

اللہ داد اخوند! عبدالولی زندگی سے ناراض ہو سکتا ہے مگر تم سے نہیں۔ میرے پاس زندگی میں اور ہے بھی کیا۔ مجھے زندگی نے کیا دیا ہے سوائے تمھاری دوستی کے۔ تمھاری دوستی میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ میں کسی قیمت پر بھی تم سے ناراض نہیں ہو سکتا۔ عبدالولی نے اللہ داد کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

میرا بھی تو تم ہی سب کچھ ہو۔ اس یتیم کی زندگی میں اگر کوئی خوشی ہے تو وہ تمھاری دوستی ہے۔ اللہ داد کو رونا آ گیا۔ اس زندگی نے اگر مجھے محرومیاں ہی محرومیاں دی ہیں تو اُس کے ساتھ ایک تحفہ بھی دیا ہے جو کہ تم اور تمھاری دوستی ہے۔

اللہ داد اخوند! ہم نفرت کی ہوا کے مارے درخت کی مانند ہیں، کبھی بھی ہم پر محبت کا پھول نہیں کھل سکے گا۔ جو یہ توقع کر رہا ہے بُرا کر رہا ہے۔ ہماری رگوں میں اس معاشرے کیلئے خون کی جگہ نفرت دوڑ رہا ہے۔ اس لیے کبھی کبھار دوستی بھی سر پٹخ دیتی ہے۔ عبدالولی نے کہا۔

دونوں دوست واپس دوستی کے آسمان پر چڑھے۔ بہت دیر تک زندگی کی گزرے ہوئے دنوں پر تبصرے کیے۔ پھر سونے کیلئے اُٹھے۔ عبدالولی اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ رسی اور خنجر دونوں تکیے کے ساتھ رکھ دیے۔ اس انتظار میں لیٹ گیا کہ جب رات گہری ہو جائے گی تو پھر اپنے ارادے کو

(c) ketabton.com: The Digital Library

عملی جامہ پہنائے گا۔ سلیم کیلئے ساتھ والے کمرے میں سونے کیلئے جگہ تیار کی تھی۔ انتظار، انتظار میں آنکھ لگ گئی اور سو گیا۔

خواب میں پھر زر قا کو دیکھ رہا تھا۔ خواب میں زر قا اُسی طرح ہوتی ہے جو بچپن میں تھی۔ زر قامنت سماجت کر رہی ہوتی ہے کہ میرے سر سے چادر مت چھیننا۔ میں بغیر چادر کے زندگی نہیں گزار سکتی۔ بغیر چادر کے میری زندگی بے پردہ ہو جائے گی۔ دیکھو مجھے بے پردہ نہ کرنا۔ وہ اُسے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اُسے دور نہیں کر سکتا۔ زر قا اُس سے چپک جاتی ہے۔ پھر خواب میں زر قا غائب ہو جاتی ہے اور وہ اژدھا نظر آجاتا ہے جو اس کی طرف بڑھ رہا ہو تا ہے۔ پہلے جب اژدہا اس کی طرف آتا اور اُس کے سینے کی روشنی پر نظر پڑتی تو اژدہا سر کو جھٹکا دے کر واپس ہو جاتا۔ مگر آج اژدھا بتدریج اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے سینے کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہاں روشنی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ روشنی کہاں گئی۔ اژدہا کو جب دیکھتا ہے تو وہ اُس کے قریب ہو رہا ہوتا ہے۔ وہ بھاگتا ہے مگر بھاگ نہیں سکتا۔ پاؤں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیتے۔ اسی وقت اژدہا اُس کے قریب پہنچ کر اُس پر حملہ کرتا ہے وہ بچاؤ کیلئے ہاتھ مارتا ہے تو اسی اثناء اُس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ بہت ہی زیادہ خوف زدہ اور پسینے میں شرابور بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بستر پر لیٹا رہتا ہے۔ پھر اُٹھ کر کلاشنکوف، خنجر اور رسی لے کر کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ رات گہری ہو گئی ہوتی ہے۔ آہستہ سے جا کر محمد گل جگا دیتا ہے۔ گاڑی کی چابیاں اُس سے لے کر سلیم کے کمرے میں آجاتا ہے۔ سلیم کو جگا دیتا ہے اور اپنا عمامہ اُس کی طرف پھینک کر کہتا ہے۔

یہ باندھ لو اور چلو۔

کہاں، کہاں جانا ہے؟ سلیم اب بھی نیند میں ہوتا ہے۔ جب کچھ ہوش سنبھل گیا تو پھر پوچھا۔

کہاں جانا ہے اتنی رات کو؟ سلیم نے انکار کے لہجے میں کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اُٹھو جلدی کرو یہ عمامہ باندھ لو۔ زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ عبدالولی نے کلاشنکوف کی نلی سے سلیم کو دھکا دیا۔

سلیم بھی کیا کرتا، عمامہ اُلٹا سیدھا باندھا، چپل پہنے اور ساتھ روانہ ہوا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے، عبدالولی نے گاڑی سٹارٹ کی اور روانہ ہو گئے۔ وہ گاڑی بہت تیز چلا رہا تھا۔

تھوڑا آہستہ چلو۔ سلیم نے کہا۔

چُپ۔ عبدالولی نے انگلی مُنہ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد عبدالولی ایک چیک پوسٹ پر رُکا۔ دو طالب آئے تو عبدالولی نے اُن سے پوچھا۔

بڑا کہاں ہے؟

حافظ صاحب! وہ تو آج گھر چلا گیا ہے۔

عبدالولی گاڑی سے اُترتا ہوا سلیم سے مخاطب ہوا۔

تم بھی اُترو۔

وہ بھی نیچے اُتر گیا۔

ڈرائیور سے کہو ایک گاڑی نکالے۔ عبدالولی نے ایک طالب سے کہا۔

وہ گیا اُس نے ڈرائیور کو جگایا۔ ڈرائیور نے گاڑی نکالی۔ عبدالولی نے سلیم کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

چچا کے بیٹے! یہ تمھیں بارڈر کراس کرا دے گا۔ پھر جہاں تمھاری مرضی جاؤ تم آزاد ہو۔

کیا؟ سلیم کو یقین نہیں آرہا تھا۔

تم کیا کہہ رہے تھے کہ میں جاؤں؟ سلیم سمجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کرے۔ خوشی کے مارے کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر پھرنے لگا۔

میں جاؤں، میں گھر جاؤں؟ سلیم عبدالولی کے سامنے کھڑا ہوا۔

ہاں گھر جاؤ۔ عبدالولی نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

سلیم پاگلوں کی طرح بغیر کچھ کہے بھاگ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اسے بارڈر پار پہنچا کر واپس آ جاؤ۔ عبدالولی نے ڈرائیور سے کہا۔ پھر سلیم کی طرف متوجہ ہوا۔ میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی سر سے چادر اُٹھالوں۔ اور ہاں میرے گھر میں میرے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، سمجھے۔

ہاں، ہاں۔ سمجھ گیا۔ کچھ نہیں کہوں گا۔ سلیم کو بہت جلدی تھی۔

جاؤ۔ عبدالولی نے اُسے کاندھے پر تھپکی دی۔

وہ روانہ ہوئے۔ عبدالولی کی آنکھوں میں آنسو کے دو بڑے قطرے جم گئے۔ جیسے وہ بھی اس سے سلیم کی طرح گھر کی خواہش کر رہے ہوں۔ اپنے گھر کے خواہشمند ہوں۔

صبح ناشتے کے وقت اللہ داد جب عبدالولی کے کمرے میں گیا تو عبدالولی ابھی تک سویا ہوا تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا اور ایک طالب سے پوچھا۔

میں اپنے کمرے میں چائے پیوں گا۔ وہ چائے وہی لے گیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اللہ داد اُس کمرے میں گیا جہاں سلیم تھا۔ کمرے کا دروازہ جب کھولا تو سلیم وہاں موجود نہ تھا۔ پریشانی میں نعرہ لگایا۔

محمد گل اخوند! محمد گل اخوند! کہاں مر گئے۔ محمد گل اخوند! اللہ داد اوطاق کے بیچ کھڑا آواز لگا رہا تھا۔

ہاں مولوی صاحب! یہاں ہوں، کیا بات ہے؟ محمد گل ایک کمرے سے نکلا۔

یہ آدمی کہاں ہے؟ اللہ داد نے سلیم کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

اُسے رات کو حافظ صاحب اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر پتہ نہیں کہاں لے گئے۔ محمد گل نے اللہ داد کو کہا۔

کہاں لے گئے؟ حافظ صاحب اکیلے تھے یا کوئی اور بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اللہ داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

نہیں، کوئی نہیں تھا۔ حافظ صاحب اکیلے تھے۔ محمد گل نے جواب دیا۔

اللہ داد کے ذہن پر تاریکی چھا گئی۔ جلدی جلدی اپنے کمرے میں گیا اُس آدمی کو مار تو نہیں دیا۔ اللہ داد پریشانی میں خود سے پوچھنے لگا۔

یہ شخص بدلہ لینے کیلئے اندھا ہو گیا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا سوائے بدلے کے۔

اگر اُسے قتل کر دیا ہے تو پھر اتنی گہری نیند کیسے سو سکتا ہے۔ اللہ داد نے اپنے آپ سے سوال و جواب شروع کر دیے۔

واپس کمرے سے نکلا اور پھر اوطاق سے باہر نکلا۔ آدھے گھنٹے کے بعد واپس اوطاق آیا۔ چہرے پر بے چینی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ حافظ صاحب اُٹھ گئے۔ اللہ داد نے ایک طالب سے پوچھا۔

ہاں۔ ابھی ابھی میں نے چائے دی۔ طالب نے جواب دیا۔

اللہ داد کا دل نا چاہتے ہوئے بھی اُس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ کمرے کے دروازے میں کھڑا ہو کر عبدالولی کو دیکھ رہا تھا۔ بڑے غور سے اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جیسے ایکسرے کر رہا ہو۔ عبدالولی ہنسا۔ اللہ داد پھر پُر سکون ہوا۔ چہرے پر خوشی دوڑی۔

آخر آزاد کر دیا۔ کتنا اچھا کام کیا۔ اللہ داد عبدالولی کے سامنے بیٹھ گیا۔

کس کو آزاد کیا، کس کی بات کر رہے ہو۔ عبدالولی نے نا سمجھنے کی انداز میں کہا۔

تمھارا چچازاد سلیم کا کہہ رہا ہوں۔ اللہ داد نے جوادیا۔

ہاں آزاد کر دیا۔ ہمیشہ کیلئے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا اُسے۔ عبدالولی نے کہا۔

نہیں جناب! یہ ہو نہیں سکتا۔ اللہ داد نے نفی میں سر ہلایا۔

کیوں نہیں ہو سکتا، عبدالولی نے اللہ داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

آج جو تمھارے چہرے پر اطمینان ہے اور جو تم اتنے پُر سکون ہو یہ میں تمھاری زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اللہ داد نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

واقعی یہ بہت ہی اچھا بدلہ ہے۔ اگر دشمن سے بدلہ لینا چاہتے ہو تو اُسے معاف کرو۔
اللہ داد اخوند پوری تیاری کی تھی کہ ماردونگا، مگر یہ اللہ کی مرضی ہے، وہ خوب جانتا ہے۔
عبدالولی نے کہا۔

گھر کے لیے سلام اور خیریت کا احوال کا کہا۔ اللہ داد نے پوچھا۔

نہیں بلکہ یہ کہا کہ میرے بارے میں کسی کو نہ بتانا۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

یار بہت ظالم شخص ہو۔ آخر اپنوں کو کس چیز کی سزا دے رہے ہو۔ اللہ داد نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

اللہ داد اخوند! سزا نہیں دے رہا ہوں اور انہیں آزمائش میں اُنہیں ڈالنا چاہتا۔ میرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ حالات دن بدن خراب ہوتے جارہے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ میدان چھوڑ دوں اور بھاگ جاؤں۔ شہادت قبول ہے مگر میدان سے نہیں بھاگوں گا۔ تو اگر زندہ ہونے کے بارے میں انہیں اطلاع ملے تو وہ پھر پُر اُمید ہو جا ئینگے۔ اُمید نہیں دلانا چاہتا۔ اب وہ صبر کر چکے ہونگے۔ مر گیا ہے یہی سمجھ رہے ہونگے۔ دوسری بار کے موت کا زخم نہیں دینا چاہتا۔ پُرانے زخم بہت ہیں جو میں نے اُنہیں دیے ہیں۔ عبدالولی کے لہجے میں تبدیلی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

یار پاگل مت بنو، تم دیکھ نہیں رہے کتنے لوگ آرہے ہیں۔ امریکہ کے مقابلے کی قوت ہمارے ان بازوؤں میں نہیں، لوگ نکلنے کی کوشش کررہے ہیں میں تو کہتا ہوں ابھی نکل جاؤ، آدھے سے زیادہ علاقہ طالبان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ یہاں پر بھی نشان زدہ جگہوں پر بمباری ہو رہی ہے۔ بہت جلد یہ علاقہ بھی طالبان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اللہ داد نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

اللہ داد اخوند! میں نے پوری زندگی اس کیلئے وقف کی ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں تو موت کی خواہش رکھتا ہوں۔ زندگی میں اندھیروں کے سوا کچھ نہیں۔ کم از کم شہادت تو نصیب ہو گی۔ میری طرف آتے ہیں یا نہیں، میں میدان نہیں چھوڑوں گا۔ آزمائش کے وقت میدان سے فرار ہونا میں بے غیرتی سمجھتا ہوں۔ عبدالولی نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

کسے غیرت دکھاؤ گے۔ امریکن تمھارے لیے نیچے اُتریں گے، قطعاً نہیں۔ تمھارے مسلمان بھائی کے ہاتھوں میں بندوق دے گا اور ہمارے لیے بھی بندوق کا بندوبست کرے گا، وہ ہمیں ماریں گے ہم اُنہیں۔ پچھلا کھیل دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ ایک کافر اور دوسرا مسلمان بن جائے گا۔اللہ داد نے ایک تجربہ کار کی طرح کہا۔

جو کافروں کے ساتھ کھڑے ہوں اُن کے خلاف جنگ کرنا جہاد ہے۔ عبدالولی جذباتی ہوا۔

یہ تو میری اور تمھاری سوچ ہے۔ عوام ہمیں عزت دے رہی ہے، ہر حکم مانتی ہے، اس طرح نہیں ہے۔یہ سب کچھ خوف سے کرتے ہیں۔ہم نے ان کے سر ڈنڈے سے سیدھے کیے ہیں۔ ہمیں اللہ نے بہت اچھا موقع دیا مگر ہم نے ضائع کیا۔ عوام میں ہم نے دین پاک اسلام کی محبت کی بجائے نفرت بکھیری، اور دنیا میں بھی اسلام نہ بدلنے والے نہ ماننے والے دین کے نام پر متعارف کروایا۔اللہ داد نے حقیقت کی طرف نشاندہی کی۔

اللہ داد اخوند! اس طرح کے لوگ بہت کم ہیں جو تمھاری طرح کی سوچ رکھتے ہیں۔اس طرح کے لوگ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔زندگی کا نام حقیقت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ٹیڑھے منہ ٹوپی مکے سے سیدھے ہوتے ہیں۔ عبدالولی نے ہاتھ سے مکا بنا کر کہا۔

اس ملک کے عوام کی بدبختی یہی ہے کہ ہر کوئی ان کے سروں پر حکمرانی کرنے کا خواہش مند ہے۔دل کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ اسی لیے یہ بھی ایسے بن گئے ہیں کہ جس کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھا اُسی کے سامنے سر ہلاتے ہیں۔اللہ داد نے بہت ہی مایوس کن لہجے میں کہا۔

تم کیوں فکر کرتے ہو، فکر وہ کرے جس کے پاس فکر نہ ہو۔ چلو باہر گشت پر نکلتے ہیں۔ عبدالولی نے کہا۔پھر دونوں باہر نکل گئے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۲۲)

رات کو عبد الولی نے ریڈیو میں سنا تھا کہ طالبان کا دور حکومت بہت جلد ختم ہونے والا ہے۔ جنوب کے کچھ صوبے اب بھی اِن کے کنٹرول میں ہیں جو جلد ان کے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔

صبح جب یہ لوگ گشت کر رہے تھے تو لوگوں کے چہروں سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ جلد تم لوگوں کے زور زبردستی اور پابندیوں سے جان چھوٹ جائے گی۔ عبد الولی نے اللہ داد سے پوچھا۔

ان لوگوں کے رویوں میں تبدیلی نہیں آئی؟

ہاں صاف دکھائی دے رہا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ مُنہ سے نہیں بول رہے مگر ان کے اُٹھنے بیٹھنے سے یہ تبدیلی دیکھی جاسکتی ہے۔ اللہ داد نے اُس کی باتوں کی تصدیق کی۔

ان میں اب مدافعت کی طاقت باقی نہیں رہی ورنہ یہ قوم ہر غاصب کے خلاف لڑی ہے۔ عبد الولی نے اللہ داد سے کہا۔

ایسا نہیں ہے جیسے تم کہہ رہے ہو۔ مدافعت کی طاقت ہے لیکن بھروسہ نہیں کر رہے۔ اب یہ کسی پر اعتماد نہیں کرسکتے۔ جس کسی کے ساتھ دوستی کی ہے انہوں نے انہیں دھوکا دیا ہے۔ اللہ داد نے جواب دیا۔

اللہ داد اخوند! میں کافی عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمھارا طالبان کے ساتھ اختلاف ہے اور پھر تمھارے زخمی ہونے کے بعد یہ اختلاف شدت اختیار کر گیا ہے۔ عبد الولی نے دل میں پیدا ہونے والے شک کا اظہار کیا۔

حافظ صاحب! ہم بہت سادہ ہیں۔ لوگ ہمیں اپنے منافع کیلئے بہت آسانی سے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کس طرح تو کبھی کس طرح۔ کاش اس عوام کا ایک عالم، دانا اور حقیقی رہنما ہوتا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں یقین سے کہتا ہوں کہ ہر چیز ان کے ہاتھوں میں ہوتی۔ اللہ داد نے بھی بلا خوف اپنی بات کہہ ڈالی۔

کیا مطلب! ہمارے رہنما نہیں سمجھتے، حقیقی رہنمائی نہیں کر رہے، یا پھر کچھ اور؟ عبد الولی نے حیرانی سے پوچھا۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ نہیں کرتے۔ کرتے ہونگے۔ جو علم رہنمائی کیلئے چاہیئے ہو سکتا ہے اُس میں ہم ابھی تک پیچھے ہوں۔ اپنی سوچ سے فیصلہ کرنے کا حوصلہ ضروری ہے۔ ہم تو ایسے کارتوس ہیں کہ جس نے چاہا جس بندوق میں ڈالا اُسی سے نکلتے ہیں۔ اللہ داد نے جواب دیا۔

میں آخر تک تمھاری یہ بات نہیں سمجھ سکا۔ عبد الولی نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

یہی تو کہہ رہا ہوں، مطلب بھی یہی ہے کہ تمھارے جیسے لوگ نہیں سمجھتے۔ اگر سمجھ گئے تو وہ دن تبدیلی کا ہو گا۔ اس عوام کے مسائل کے اختتام کا دن۔ لیکن یہ مجھے مشکل لگتا ہے۔ اللہ داد نے ناامیدی میں سیٹ سے سر لگاتے ہوئے کہا۔

دو پہر کو جب گشت سے واپس آئے تو اللہ داد نے عبد الولی سے کہا۔

میں چاہتا ہوں اپنے گاؤں جاؤں۔ اپنے قبرستان جاؤں۔

گاؤں کا کیا کرو گے؟ پچھلے سال جب گئے تھے تو تم نے کہا تھا کہ وہاں چند گھروں کے سوا کچھ نہیں اور قبرستان میں بھی ماں باپ کی قبریں معلوم نہیں۔ عبد الولی نے کہا۔

تمھاری بات ٹھیک ہے۔ مگر ماں کو میں نے رات کو خواب میں دیکھا، آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہاتھ میرے لیے ایسے پھیلائے تھے جیسے وہ بہت ہی اداس ہو۔ قبرستان جا کر دعا کروں گا اور دو رکعت نفل بھی پڑھ لوں گا۔ کچھ دل کو تسلی ہو جائے گی۔ اللہ داد نے کہا۔

ٹھیک ہے، ایسا کرو کہ گاڑی ساتھ لے جاؤ۔ محمد گل اخوند اور چند طالبان بھی ساتھ چلے جائیں گے۔ سیر بھی کر لو گے، واپسی پر اگر دیر بھی ہو جائے گی تو ساتھ رہیں گے۔ میں چھوٹے طالب کے ساتھ اگر کوئی کام ہوا تو نکل جاؤنگا۔ عبد الولی نے مشورہ دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اللہ داد نے بھی عبدالولی کے مشورے پر عمل کیا اور چند طالبان کے ساتھ اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبدالولی نے ریڈیو کو آن کیا۔ ریڈیو میں یہ خبریں جاری تھیں کہ بہت جلد اُن کے صوبے پر زمینی حملہ ہو گا۔ اردگرد کے صوبے تقریباً قبضہ کر لیے گئے ہیں۔

عبدالولی نے اوطاق میں رہ جانے والا چھوٹا طالب، دو اور طالبان کو بلا کر ان سے کہا۔ تم لوگ والی صاحب کے دفتر جاؤ اور حالات معلوم کرو۔ صبح سے وائرلس کام نہیں کر رہا۔ ریڈیو کی خبروں نے عبدالولی کو تشویش میں ڈالا۔ طالبان نے گاڑی سٹارٹ کی اور والی کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ عبدالولی اوطاق میں اکیلا رہ گیا۔ اپنا اسلحہ سمیٹا اور اپنی پسند کی ایک کلاشنکوف بکسے سے اُٹھائی۔ گولیوں کا کمر بند اُٹھایا اور پانچ میگزین گولیاں بھریں۔ کمر بند بھی گولیوں سے بھرا، کمرے میں تیار کر کے رکھا اور پھر خود کمرے کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

اللہ داد اور اُس کے ساتھیوں کو قریباً چار گھنٹے ہوئے کہ نکل چکے تھے۔ باقی طالبان کو تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ عبدالولی واپس اُٹھ کر اوطاق کے کمروں میں پھرنے لگا۔ اسی اثناء والی کے دفتر گئے ہوئے طالبان واپس آ گئے۔ عبدالولی بھاگ کر اُن کے پاس گیا اور پوچھا۔

ہاں کیا ہوا، والی صاحب ملے؟

حافظ صاحب! والی صاحب کے دفتر میں ہم نے پوچھا انہوں نے کہا کہ والی صاحب پچھلے دو دنوں سے گئے ہیں۔ ایک طالب نے جواب دیا۔

پوچھا کہ کہاں گئے ہیں؟ عبدالولی نے پوچھا۔

ہاں ہم نے پوچھا تھا مگر انہوں نے کہا کہ ہمیں معلوم نہیں کہ کہاں گئے ہیں۔ طالب نے کہا۔

تم لوگ ایسا کرو کہ اپنے اپنے اسلحے تیار کرو۔ گولیاں بھی دیکھ لو اور جمع کرو۔ اب ہم یہاں سے کوچ کریں گے۔ عبدالولی نے کہا۔

کہاں جائیں گے؟ طالب نے پوچھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس شہر میں پھریں گے اور کہاں۔ جب تک ہم بااختیار ہیں لوگوں کے گھروں میں رہیں گے۔ اگر کہیں مشکل آ پہنچی تو پھر چھاپہ مار جنگ کیلئے نکلیں گے۔ عبدالولی نے اپنے آپ سے کیا ہوا فیصلہ سنادیا۔

حافظ صاحب! آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہو، کوئی خاص بات ہے کیا؟ ایک طالب نے پوچھا۔

تم لوگوں نے راستے میں ضرور محسوس کیا ہو گا۔ مجھے ریڈیو سے معلوم پڑا ہے کہ یہاں حملہ ہونے والا ہے تو اس سے پہلے کہ وہ ہماری اوطاق تک پہنچیں ہمیں چاہیئے کہ ہم اوطاق خالی کریں۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

یہاں وہ تیاری میں مصروف تھے خبر آئی کہ اللہ داد اور اُس کے ساتھیوں کی گاڑی پر حملہ ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے ساتھ اسلحہ اُٹھایا اور اللہ داد اور اُس کے ساتھیوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں جب پہنچے تو دیکھا کہ اللہ داد کی گاڑی بالکل تباہ ہوچکی تھی۔ موقع پر موجود لوگوں نے کہا کہ زخمیوں اور لاشوں کو صوبے کے بڑے ہسپتال لے جایا جا چکا ہے۔ انہوں نے گاڑی بڑی تیزی سے ہسپتال کی طرف روانہ کی جب ہسپتال پہنچے تو محمد گل اور اللہ داد کے سوا جو بہت شدید زخمی تھے تمام ساتھی جاں بحق ہو چکے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک ہیلی کاپٹر نے گاڑی کو راکٹ سے نشانہ بنایا۔

ہسپتال میں لوگوں کا رش زیادہ ہو گیا۔ اور زخمی بھی لائے گئے۔ ان زخمیوں میں عورتیں اور بچے تھے مگر طالبان کی تعداد زیادہ تھی۔ ہسپتال میں دوائیوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹروں کی بھی قلت تھی۔ وہ طالبان موجود تھے جو پٹی وغیرہ کر سکتے تھے۔ وہ ڈاکٹروں کی ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے۔

عبدالولی اللہ داد کے سرہانے کھڑا تھا۔ اللہ داد شدید زخمی تھا۔ اگرچہ اس کے زخموں پر پٹی بندھی تھی لیکن وہ اب تک بے ہوش تھا۔ عبدالولی بہت بے چین تھا۔ اللہ داد کے ساتھ اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

بھی اُس کے جاننے والے طالبان زخمی تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ ساتھ ہی محمد گل زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔ وہ جیسے ہی اُس کے قریب ہوا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اُس نے آنکھیں کھول لی۔ اور ایک ہچکی لی اور ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کیں۔ اُس نے اُس کے چہرے پر چادر ڈالی اور اللہ داد کی طرف آیا۔ جب اُسے ٹیکا لگایا جارہا تھا تو اُس نے جلدی سے اللہ داد کا ہاتھ ٹیکے کیلئے پکڑا۔

کونسی جگہ زیادہ زخمی ہوئی ہے؟ عبدالولی نے طالب ڈاکٹر سے پوچھا۔

کیا کہوں کہ کونسی جگہ زخمی ہے، دوسروں نے زخم صاف کیے ہیں میں نے نہیں دیکھے۔ میں تو صرف درد کا ٹیکا لگا رہا ہوں۔ ڈاکٹر طالب نے جواب دیا۔

کیا ہو گا اس کا؟ عبدالولی نے پر اُمید نظر سے دیکھا۔

خدا کی مرضی۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہو گا۔ ڈاکٹر طالب نے جواب دیا۔

عبدالولی کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو نظر آنے لگے۔ رات گئے ایک بار اللہ داد نے آنکھیں کھول لیں پھر دوبارہ بے ہوش ہوا۔ کچھ دیر کے بعد پھر ہوش میں آیا۔ عبدالولی ساتھ بیٹھا اُٹھ کر اُس کے قریب ہوا۔

اللہ داد اخوند! کیسے ہو؟

اللہ داد کے ہونٹوں پر ایک تبسم سی اُبھری، سر کو ہلایا، پھر پانی مانگنے کا اشارہ کیا۔ عبدالولی نے جلدی سے پانی کا گلاس دیا۔ اللہ داد نے پورا گلاس پانی پی لیا۔ عبدالولی نے چاہا کہ ایک گلاس پانی اور لے آئے لیکن اللہ داد نے منع کیا۔ اللہ داد کا سر عبدالولی کے سینے کے ساتھ لگا ہوا تھا کہ اچانک ایک نافرمان آنسو کا قطرہ اللہ داد کے چہرے پر آگرا۔ اللہ داد نے عبدالولی کی طرف دیکھا۔ داہنا ہاتھ بڑی مشکل سے اُٹھا کر عبدالولی کے ہاتھ پر رکھا۔ بہت دھیمی آواز میں اُس سے کہا۔

مجھ سے ایک وعدہ کرو۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

تم بولو کہ کیا کروں۔ تم جو بولو گے میں وہی کروں گا۔ عبد الولی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر تھوڑا سا اُٹھایا۔

تم اس ملک سے نکلو گے اور اپنے گھر جاؤ گے۔ اللہ داد نے نحیف آواز میں کہا۔

تمھیں اس حال میں چھوڑ کر چلا جاؤں، کیوں مجھے بے غیرت سمجھا ہے۔ عبد الولی جذباتی ہوا۔

جب تک میں زندہ ہوں مت جانا، لیکن اگر میں۔۔۔۔۔

عبد الولی نے اللہ داد کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔

بس اور آگے کچھ مت کہنا۔ تم میرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ جب تم ٹھیک ہو جاؤ تو دونوں ساتھ چلیں گے۔ عبد الولی نے رونے کی انداز میں کہا۔

مجھے یقین نہیں، میں سمجھ رہا ہوں اب صرف دعا کرنا ہو گی۔ اگر چاہتے ہو کہ میرے ساتھ وفا کرو تو میرا اسلام اپنی ماں کو ضرور پہنچانا۔ وعدہ کرو کہ یہ کام کرو گے۔ اللہ داد نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا۔

وعدہ ہے میرا، ضرور کروں گا سلام، انشاء اللہ۔ لیکن اللہ تمھیں صحت دے۔ عبد الولی نے کہا۔

اللہ داد نے اپنا سر اُس ک گود میں ڈھیلا کیا اور آنکھیں بند کیں۔ جیسے وہ مطمئن ہو چکا ہو۔ عبد الولی نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔

جلدی کرو اِس گلاس میں پانی لے آؤ۔ وہ گلاس پانی سے بھر کر لے آئے۔ عبد الولی نے اُس کا سر گود سے اُٹھایا اور اُسے پانی پلایا۔

اللہ داد نے آدھا گلاس پانی پی لیا اور پھر گلاس سے مُنہ ہٹا لیا۔ ایک گھنٹے کے بعد اللہ داد کی حالت خراب ہو گئی۔ عبد الولی نے اُس کا سر اپنی گود میں رکھا تھا۔ اللہ داد ایک بار آنکھیں کھول

(c) ketabton.com: The Digital Library

لیتا پھر اُس پر بے ہوشی طاری ہو جاتی۔ آخری بار آنکھیں کھولیں، عبد الولی کی طرف دیکھا اور پھر اُسی طرح آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ جیسے عبد الولی کی تصویر وہ اپنی آنکھوں میں محفوظ کرنا چاہتا ہو۔

اِنّاَ لِلّٰہِ وَاِنّاَ اِلَیہِ رَاجِعُون۔ عبد الولی نے دُعا پڑھی اور اُس کی آنکھیں اپنے ہاتھوں سے بند کر دیں۔

اپنے تمام ساتھیوں کو جو شہید ہوئے تھے کو گاڑی میں ڈالا اور اپنے اوطاق کی طرف روانہ ہوا۔ صبح کو ارد گرد کے لوگوں کو بلایا۔ اللہ داد کے ساتھ تمام ساتھیوں کو اپنے اوطاق میں سپردِ خاک کیا۔ اُس کے بعد ساتھیوں کو اجازت دی اور خود اللہ داد سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کیلئے بارڈر کی طرف چل پڑا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

(۲۳)

عبدالولی جب گھر کے درازے کے قریب پہنچا تو رات نے اپنی چادر اوڑھ چکی تھی۔ گیارویں رات کی چاند نے نے بھی اپنی روشنی عبدالولی جیسے مسافر کو راستہ دکھانے کیلئے بکھیر، رکی تھی۔

دل کبھی چاہتا تو کبھی نہ چاہتا۔ دروازے کے پاس کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ گھر میں کون ہو گا؟ مجھے پہچان بھی پائیں گے یا نہیں؟ دیر بھی ہو چکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی چور کا گمان کرے۔ پھر ہمت کی، دروازے کو آہستہ دھکا دیا۔ دروازے کے کھلنے سے ایک آواز کانوں تک پہنچی۔

میرا لاڈلہ آئے گا، کالی آنکھیں، سفید دانت، سیاہ بالوں پر سفید عمامہ ہو گا۔ سینے میں قرآن کا نُور ہو گا۔ علم کے خزانے سے سب کی جھولی بھر دے گا۔ اے اللہ! آپ کی راہ میں گیا ہے۔ میں نے تو آپ کے توکل پر بھیجا تھا۔ پھر کیوں آپ نے اُسے جیتے جی مجھ سے چھینا۔ آواز سسکیوں میں گم ہو گئی۔ کچھ دیر بعد پھر آواز آئی۔

میرا لاڈلہ ضرور آئے گا۔

عبدالولی نیم وا دروازے میں کھڑا تھا اچانک اُس کا ہاتھ دروازے کی زنجیر سے لگا۔

تم آ گئے، خدا نے میری سُن لی۔ دروازے سے دور چارپائی پر لیٹے کسی نے کہا۔

آؤ، آؤ۔ میں نے یہ چارپائی تمھارے لیے یہاں رکھی ہے کہ میرا ولی خان بیٹا آئے گا۔ قریب آؤ، ماں تمھارے صدقے۔ آج شام سے تمھاری خوشبو میں محسوس کر رہی تھی۔

عبدالولی سمجھ نہیں سکا کہ وہ کس طرح ماں کی چارپائی تک پہنچا۔ اور نہ یہ سمجھ سکا کس وقت اُس نے ماں کے سینے پر سر رکھا۔ سر اُٹھایا تو ماں کا سینہ اُس کے آنسوؤں سے ایسا تر ہوا تھا جیسے بارش ہو گئی ہو۔ اور بال ایسے بھیگ چکے تھے جیسے دھوئے گئے ہوں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ولی بیٹے! تمھیں پتہ ہے تمھارے جانے کے بعد میں نے یہ دروازہ بند نہیں کیا اور نہ ہی سردیوں میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا ہے۔ میں تو تمھاری طرح ظالم نہیں جو بھول گئے۔ میرے دل کے آنگن میں چراغ کی طرح جل رہے تھے۔ یہ چراغ میں نے دل کے خون سے جلائے رکھے ہیں۔ تمھارے سینے میں تو قرآن کی روشنی بھی ہے پھر تم نے کیوں مُنہ پھیرے رکھا۔

بس ماں بس! عبدالولی نے ماں کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔ میرے سینے میں اندھیرا ہے صرف اندھیرا۔ میں تو اُن جیسا رہ گیا ہوں جو نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ ماں میں لُٹ گیا، قرآن میرے سینے سے نکل گیا ہے۔ محبت میرے دل سے نکل گئی ہے۔ عقل میرے دماغ سے نکل گئی ہے۔ اور دید میری آنکھوں سے چلی گئی ہے۔ ماں آپ کا بیٹا اُس جواری کی طرح ہے جو اپنی ماں کا پیار بھی ہار چکا ہو۔ آپ نے میرے انتظار میں چارپائی صحن کے درمیان رکھی ہے اور میں نے آپ کا پیار تک دل سے نکال دیا ہے۔ میں اس قابل نہیں کہ کوئی میرا انتظار کرے۔ بیٹا کہہ کر پکارے۔ اپنے آنسو میرے لیے بہائے۔ مجھے یہ حق حاصل نہیں۔ میں یہ حق کھو چکا ہوں ماں۔ عبدالولی نے کہا۔

ایسا مت کہو۔۔۔۔۔ ماں تمھارے صدقے۔۔۔۔۔ ایسا مت کہو۔۔۔۔۔۔ ایک بار اپنا ماتھا میرے قریب کرو، ہونٹ تمھارا ماتھا چومنے کیلئے سوکھ چکے ہیں۔ ماں نے عبدالولی کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ لیے۔

ماں کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اُس کے ماتے سے اپنے ہونٹ جو کہ عبدالولی کے انتظار میں سوکھ گئے تھے ہٹا لے۔ مگر نہ وقت رُک سکتا تھا نہ یہ دونوں اسی طرح رہ سکتے تھے۔ کیونکہ وقت کبھی کبھی ارمان بھی قتل کر دیتے ہیں۔ ماں نے جب ہونٹ ماتھے سے ہٹائے تو عبدالولی نے کہا۔

ماں! جب سے آپ کی باہوں سے نکلا ہوں پھر سکون نصیب نہیں ہوا۔ ماں جب آپ لوگوں نے مجھے طالب بنایا ابھی تک طلب میں ہوں۔ طلب ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ مجھے دنیا کے ہر شخص نے طالب کی نظر سے دیکھا۔ اُس طالب کی طرح جو نہ دل رکھتا ہے اور نہ دل میں جذبات۔ مولوی نے مسجد میں وظیفے اکھٹے کرنے کیلئے چادر دی۔ ہر گھر کے سامنے وظیفے کی طلب

(c) ketabton.com: The Digital Library

نے کھڑا کر دیا۔ مدرسہ میں چندہ کاپی دے دی گئی ۔ ہر مسجد میں فقیر کی طرح چادر بچھائی۔ تمھارے اس طالب بیٹے کو کسی نے کیا دیا ہے۔ کچھ نہیں۔۔۔۔ ابھی تک طلب میں ہوں۔ محبت کی طلب، سکون کی طلب، میں کبھی مولوی نہیں بن پاؤں گا ماں۔ آپ کے طالب کو دنیا نے کشکول ہاتھ میں دے دیا ہے۔ پھر ایسا نہیں کہ صرف در بہ در بلکہ بے در بھی ہو گیا ہوں، اور بے درد بھی۔ ہر طالب میری طرح بے در اور بے درد ہے۔ نہ اُس کا گھر ہے نہ بھائی۔ نہ کسی کا اپنا ہے اور نہ ہی کوئی اُس کا اپنا۔

ماں! ماؤں سے کہو کہ طالب پیدا نہ کریں۔ طالب کو یہ معاشرہ بڑی بیچ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اس معاشرے کے منفی رویوں کا پیدا کردہ کردار ہے۔ جو ہر وقت منفی رویے کی نمائندگی کرتا ہو گا۔ ہمارے ہاں ہر گھر میں ایک طالب ہے ماں۔ جب تک یہ معاشرہ طالب پیدا کرے گا اور فقیر کی نظر سے دیکھے گا، سینوں میں قرآن کی روشنی سے بدلہ لینے کی آگ جلتی رہے گی۔ عبدالولی نے چند جملوں میں اپنی زندگی کا حال بیان کر دیا۔

دونوں صبح تک اسی چارپائی پر بیٹھے رہے اور ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے رہے۔ صبح والد اور بھائی وغیرہ کو پتہ چلا تو گھر میں خوشی کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ وہ طوفان جسکا برسوں سے اس گھر نے انتظار کیا تھا۔ پہلوان نے صبح مسجد میں مولوی صاحب کو کہا کہ رات کو عبدالولی گھر آیا۔ نماز کے بعد مولوی صاحب نے مسجد میں اعلان کیا کہ پہلوان کا بیٹا حافظ عبدالولی صاحب گھر پہنچے ہیں ہمیں چاہیئے کہ اُسے سلام کرنے جائیں۔ گاؤں کے تمام لوگ مرد اور عورتیں عبدالولی کے گھر مبارک باد دینے آئے۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ جنہیں یہ خبر ملتی وہ بھی مبارک باد دینے آتے۔ دو ہفتے ایسے مبارک بادیوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ ایک دن ایک بڑی کالی رنگ کی گاڑی جس کے شیشے بھی کالے تھے عبدالولی کے گھر کے سامنے رُکی۔ دو انجان آدمی گاڑی سے اُترے اور عبدالولی کے گھر کی بیٹھک میں عبدالولی سے سلام و دعا کیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

عبد الولی نے اُن سے پوچھا کہ میں نے آپ لوگوں کو پہچانا نہیں، میرے خیال میں تمھارے جاننے والے ہیں۔ عبد الولی نے اپنے بھائی احمد خان سے کہا۔

حافظ لالا! میں بھی نہیں جانتا۔ احمد خان نے جواب دیا۔

ہم جان پہچان والے لوگ ہیں حافظ صاحب۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا۔

چائے پینے ک بعد انہوں نے رخصت چاہی۔ دروازے میں جس وقت عبد الولی انہیں رخصت کر رہا تھا تو ایک شخص نے کہا۔

حافظ صاحب! آپ کو والی صاحب نے یاد فرمایا ہے۔

کون والی صاحب؟ عبد الولی نے حیران ہو کر پوچھا۔

آپ جس صوبے میں اپنی ذمہ داری سر انجام دے رہے تھے وہ والی صاحب۔ شخص نے جواب دیا۔

کہاں ہے والی صاحب؟ عبد الولی نے پوچھا۔

وہ کوئٹہ کینٹ میں ہیں اور آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔ اور یہ پیغام دیا ہے کہ آپ اُن سے ضرور ملیں۔

عبد الولی اُسی طرح دروازے میں حیران کھڑا رہ گیا اور لوگ چلے گئے۔

ختم شد

۱۶،۰۴،۲۰۱۷

Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library